زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہ نامہ اشراق

فروری 2024ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاستہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہنامہ

جلد ۲ شمارہ ۲ فروری ۲۰۲۴ء رجب ۱۴۴۵ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس

مدیر انتظامی: فرحان سید

مجلس تحریر: ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

معاون مدیر: شاہد محمود

فہرست

شذرات

عبادات اور تزکیۂ نفس — سید منظور الحسن — 3

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 99-110 (6) — جاوید احمد غامدی — 14

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 18

مقامات

شعلہ و نشیمن — جاوید احمد غامدی — 19

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (7) — سید منظور الحسن — 21

نقطۂ نظر

تعلیم کا کاروبار — ڈاکٹر عرفان شہزاد — 28

قدیم مفسرین کے تسامحات اور مولانا فراہیؒ (2) — ابو سعد اعظمی — 32

مختارات

نبی ﷺ سے ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت (2) — امین احسن اصلاحی — 40

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (2) — سید ابوالحسن علی ندوی — 46

وفات سلیمان علیہ السلام — علامہ شبیر احمد ازہر — 54

سیر و سوانح

حیاتِ امین (6) — نعیم احمد بلوچ — 59

ادبیات

پتھر — جاوید احمد غامدی — 70

حالات و وقائع

خبر نامہ ”المورد امریکہ“ — شاہد محمود — 72

سید منظور الحسن

عبادات اور تزکیۂ نفس

اللہ تعالیٰ القدوس ہے، یعنی سراسر پاکیزگی ہے۔ آخرت میں وہ اپنے قرب سے اُنھی لوگوں کو فیض یاب کرے گا، جو پاکیزہ ہوں گے۔ یہی لوگ اُس کی پاک صاف جنت کے مستحق ہوں گے۔ پاکیزگی ہی وہ مقصد ہے، جس کے لیے اللہ نے اپنے نبیوں کو مبعوث فرمایا اور دین کی صورت میں اپنی ہدایت نازل فرمائی۔ امام امین احسن اصلاحی نے اللہ کی صفت القدوس کی تشریح میں اِسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اَلْقُدُّوْسُ'۔ وہ ہر عیب، ہر نقص اور برائی و خرابی سے بالکل پاک و منزہ ہے، اِس وجہ سے اُس نے اپنے بندوں کو پاکیزہ بنانے کے لیے کتاب اتاری اور رسول بھیجے تاکہ بندے پاکیزہ بن کر اُس کا قرب حاصل کرنے کے اہل بن سکیں۔ سورۂ جمعہ میں 'ملك' اور 'قُدُّوْس'، دونوں صفتوں کا حوالہ دے کر اُن کا مقتضیٰ واضح فرمایا دیا ہے۔ پہلے اپنی صفات کا حوالہ اِن الفاظ میں دیا: 'اَلْمَلِكِ الْقُدُّوْسُ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ' اُس کے بعد اپنی اِن صفات کا مقتضیٰ اِس طرح واضح فرمایا:

'هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ' (وہی ہے جس نے اٹھایا امیوں میں ایک رسول اُنھی میں سے جو اُس کی آیتوں کی تلاوت اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے۔)

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ رسول اور کتاب تو اُس نے اِس لیے بھیجے کہ وہ بادشاہ ہے، اُس کے بادشاہ ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنی رعیت کے پاس اپنے سفیر بھی بھیجے اور اپنے احکام بھی

اور اپنے بندوں کا تزکیہ اِس وجہ سے اُس نے چاہا کہ وہ قدوس اور پاک ہے۔ وہ یہ نہیں پسند کر سکتا کہ اُس کے بندے گناہوں میں آلودہ رہیں۔“(تدبر قرآن 8 / 313-312)

چنانچہ انسان الملک القدوس کے جتنا قریب ہوتا ہے، اتنا ہی پاکیزہ ہوتا ہے۔ عبادات اِس قرب کو بڑھاتی ہیں، جس کے نتیجے میں انسان کے نفس کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ اگر زمین کی کاشت داشت اور نشوونما کو مثال بنایا جائے تو تطہیر بدن، تطہیر خورونوش اور تطہیر اخلاق کے احکام نفس انسانی کی کھیتی سے جھاڑ جھنکار اور آلایشیں صاف کر کے اُسے اِس قابل بناتے ہیں کہ اُس میں عمل صالح کی فصل کاشت کی جا سکے اور عبادات اِس فصل کو نشوونما دیتی اور اس کی نگہ داشت کا اہتمام کرتی ہیں۔ استاذِ گرامی کے نزدیک عبادات کے ذریعے سے تزکیۂ نفس اپنے کمال کو حاصل کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”دین کا مقصد تزکیہ ہے۔ اِس کے منتہاے کمال تک پہنچنے کا ذریعہ اللہ اور بندے کے درمیان عبد و معبود کے تعلق کا اُس کے صحیح طریقے سے قائم ہو جانا ہے۔ یہ تعلق جتنا محکم ہوتا ہے، انسان اپنے علم و عمل کی پاکیزگی میں اتنا ہی ترقی کرتا ہے۔ محبت، خوف، اخلاص و وفا اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں اور بے نہایت احسانات کے لیے احساس و اعتراف کے جذبات، یہ اِس تعلق کے باطنی مظاہر ہیں۔ انسان کے شب و روز میں اِس کا ظہور بالعموم تین ہی صورتوں میں ہوتا ہے: پرستش، اطاعت اور حمیت و حمایت۔ انبیا علیہم السلام کے دین میں عبادات اِسی تعلق کی یاددہانی کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ پرستش ہے۔ قربانی اور عمرہ کی حقیقت بھی یہی ہے۔ روزہ و اعتکاف اطاعت، اور حج اللہ تعالیٰ کے لیے حمیت و حمایت کا علامتی اظہار ہے۔“(میزان 267)

اِن عبادات میں سے اولین اور اہم ترین عبادت نماز ہے۔ یہ انسان سے گناہوں کی غلاظتوں کو دور کر کے اُس کو پاکیزہ بناتی ہے اور دین کے مقصد تزکیۂ نفس کو پانے کے لیے معاون ثابت ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے جہاں پاکیزگی کو کامیابی کی شرط قرار دیا ہے، وہاں اِس کے وسیلے کے طور پر ذکرِ الٰہی اور نماز کو پیش کیا ہے۔ ارشاد ہے:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَكّٰى. وَ ذَكَرَ اسۡمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى. (الاعلیٰ 87:15-14)

”البتہ فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اِس کے لیے اپنے رب کا نام یاد کیا، پھر نماز پڑھی۔“

”دین کا مقصد یہی پاکیزگی (تزکیہ) ہے، جس کا صلہ روز قیامت انسان کو فردوس بریں کی صورت میں ملے گا۔ اِس مقصد تک پہنچنے کے لیے جو طریقہ اختیار کرنا چاہیے، اُس کو اللہ تعالیٰ نے یہاں دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی انسان صفات الٰہی کے صحیح شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد پر قائم اور اپنے پورے وجود کے ساتھ اُس کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ نماز اِسی یاد اور اِسی قنوت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔“ (البیان 5/439)

لہٰذا جو شخص پاکیزگی حاصل کرنا چاہتا اور اِس کے نتیجے میں آخرت کی فوز و فلاح چاہتا ہے، اُس کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ وہ نماز کا اہتمام کرے۔ سورۂ فاطر میں نماز قائم کرنے کے حکم کے بعد ’وَمَنْ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفْسِہٖ وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ‘ (اور جو پاکیزگی حاصل کرتا ہے، وہ اپنے ہی لیے حاصل کرتا ہے اور پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔) کے الفاظ سے نماز کی یہی افادیت نمایاں ہوتی ہے۔ اِس کی وضاحت میں امام امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

”یہ نماز کے فائدے کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو شخص گناہوں کے بوجھ سے سبکدوش اور پاکیزہ ہونا چاہتا ہو وہ جھوٹے سہاروں پر اعتماد کرنے کے بجاے نماز کا اہتمام کرے۔ یہ چیز اُس کو گناہوں سے پاک کرے گی اور جس نے پاکیزگی حاصل کی، وہ اپنا ہی بھلا کرے گا۔ اِس لیے کہ اللہ کسی کی عبادت و اطاعت کا محتاج نہیں ہے، بلکہ بندے خود ہی اِس کے محتاج ہیں اور سب کی واپسی بہرحال اُسی کی طرف ہونی ہے۔“ (تدبر قرآن 6/370)

نماز گناہ کی آلایشوں کو کس طرح صاف کرتی ہے، اِس کے بارے میں استاذِ گرامی نے بیان کیا ہے کہ ہر نماز میں انسان اپنے پروردگار سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچا کر رکھے گا۔ کچھ وقفے کے بعد جب اگلی نماز آتی ہے تو وہ اپنے عہد کی تجدید کرتا ہے۔ وہ دن کا آغاز بھی نماز سے کرتا ہے اور اُس کی تکمیل بھی نماز پر کرتا ہے۔ چنانچہ نماز اُس کے شب و روز اور نتیجتاً پوری زندگی کو محیط ہو جاتی ہے۔ انسان اگر پورے شعور کے ساتھ اُسے ادا کرتا رہے تو اُس کے وجود کے ظاہر و باطن پر آنے والی آلایشیں ساتھ ساتھ صاف ہوتی رہتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”نماز گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ بندہ جب صحیح شعور کے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو خدا کے ساتھ اپنے عہد کی تجدید کرتا ہے کہ وہ اُس کی معصیت سے اجتناب کرے گا۔ اِس کے نتیجے میں وہ ایک نماز سے دوسری نماز تک کی لغزشوں پر لازماً ندامت محسوس کرتا اور اُن سے بچنے کے

لیے ایک نئے عزم اور ارادے کے ساتھ زندگی کی مصروفیتوں کی طرف لوٹتا ہے۔ غور کیجیے تو توبہ کی حقیقت بھی یہی ہے اور توبہ کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ بندے کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ ،اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ، ذٰلِكَ ذِكۡرٰى لِلذّٰكِرِيۡنَ. (ہود 11:114)

”اور دیکھو، (اے پیغمبر، اِس راہ میں ثابت قدمی کے لیے) دن کے دونوں حصوں میں نماز کا اہتمام کرو اور رات کے اوائل میں بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ایک یاددہانی ہے اُن کے لیے جو یاددہانی حاصل کرنے والے ہوں۔“

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہائے تو کیا اُس کے جسم پر میل نام کی کوئی چیز باقی رہ جائے گی؟ لوگوں نے عرض کیا: اِس صورت میں تو یقیناً میل کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے گا۔ آپ نے فرمایا: یہ پانچ نمازوں کی مثال ہے۔ اللہ اِن کے ذریعے سے بالکل اِسی طرح گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔“(میزان 273-272)

زکوٰۃ کے لفظی معنی افزایش و نمو اور طہارت و پاکیزگی کے ہیں۔ یہی معنی اُس کے اصطلاحی مفہوم میں بھی داخل ہیں۔ چنانچہ یہ مال کا وہ حصہ ہے، جو مال کے ساتھ ساتھ مال دینے والے کو بھی پاکیزہ بناتا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ اِس عبادت کا مقصد بھی تزکیۂ نفس ہے۔ استاذِ گرامی لکھتے ہیں:

”...زکوٰۃ کا مقصد وہی ہے جو پورے دین کا ہے۔ یہ نفس کو اُن آلایشوں سے پاک کرتی ہے، جو مال کی محبت سے اُس پر آسکتی ہیں، مال میں برکت پیدا کرتی ہے اور نفس انسانی کے لیے اُس کی پاکیزگی کو بڑھانے کا باعث بنتی ہے۔ اللہ کی راہ میں انفاق کا چونکہ یہ کم سے کم مطالبہ ہے، جسے ایک مسلمان کو ہر حال میں پورا کرنا ہے، اِس لیے اِس سے وہ سب کچھ تو حاصل نہیں ہوتا، جو اِس سے آگے انفاق کے عام مطالبات کو پورا کرنے سے حاصل ہوتا ہے، تاہم انسان کا دل اِس سے بھی اپنے پروردگار سے لگ جاتا اور اللہ تعالیٰ سے وہ غفلت بڑی حد تک دور ہو جاتی ہے، جو دنیا اور

اسباب دنیا کے ساتھ تعلق خاطر کی وجہ سے اُس پر طاری ہوتی ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ ہیں: آدمی کا دل وہیں رہتا ہے، جہاں اُس کا مال رہتا ہے۔ یہ بات محتاج استدلال نہیں ہے۔ آدمی جب چاہے، اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اِس کا تجربہ کر سکتا ہے۔

زکوٰۃ کا یہ مقصد قرآنِ مجید نے نہایت خوبی کے ساتھ خود بھی واضح کر دیا ہے۔ ارشاد ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا. (التوبہ 103:9)

”تم اُن کے مالوں کا صدقہ قبول کر لو، اِس سے تم اُنھیں پاکیزہ بناؤ گے اور اُن کا تزکیہ کرو گے۔“

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ. (الروم 39:30)

”اور جو صدقہ تم دیتے ہو کہ اُس سے اللہ کی رضا چاہتے ہو تو اُسی کے دینے والے ہیں جو اللہ کے ہاں اپنا مال بڑھا رہے ہیں۔“ (میزان 351)

سورۃ اللیل میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ آپ اپنا مال اِس لیے خرچ کرتے ہیں کہ اُس سے پاکیزگی حاصل ہو اور واضح کیا ہے کہ اِس کا صلہ نار سے حفاظت ہے۔ ارشاد ہے:

وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى. الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى. (92:18-17)

”اور اُس سے یقیناً دور رکھا جائے گا (ہمارا پیغمبر)، وہ انتہائی پرہیز گار جو اپنا مال اِس لیے دیتا ہے کہ اُسے تزکیہ حاصل ہو۔“

زکوٰۃ اگرچہ نظم اجتماعی کی ضرورتوں پر صرف ہوتی ہے، مگر اس کی حقیقت اللہ کی عبادت کی ہے۔ چنانچہ بندہ جب اِسے ادا کرتا ہے تو اِس کی قبولیت کا فیصلہ بھی اللہ کی بارگاہ سے ہوتا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے:

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ. (104:9)

”کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اُن کے صدقات کی پذیرائی فرماتا ہے۔“

روزہ ضبطِ نفس کی خاص عبادت ہے۔ یہ اطاعتِ الٰہی کا مظہر ہے۔ اِس میں انسان اللہ کے حکم کی تعمیل میں جائز چیزوں کو بھی اپنے لیے ممنوع کر لیتا ہے۔ روزے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ تقویٰ اختیار کریں۔ ارشاد فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ. (البقرہ 2:183)

”ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ۔“

روزے کا مقصد بیان کرنے کے لیے یہاں ’لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ‘ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔ تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ضابطوں کا پابند بنائے اور اللہ کے مقرر کردہ حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کرے۔ ہر دم ڈرتا رہے کہ اِن حدود کو توڑنے کے نتیجے میں وہ اللہ کی سزا کا مستحق ہو سکتا ہے اور اُس جنت سے محروم ہو سکتا ہے، جو اللہ نے حدود آشنا نفوس کے لیے بنائی ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ اُس کی جنت کے وارث وہی لوگ ہیں، جو متقی ہیں۔ ارشاد ہے:

تِلْکَ الْجَنَّۃُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ کَانَ تَقِیًّا. (مریم 19:17)

”یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اُن کو بنائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں گے۔“

دوسرے مقامات سے واضح ہے کہ جنت کا یہی صلہ اُن لوگوں کے لیے بھی ہے، جو تزکیہ اختیار کریں گے۔ ارشاد ہے:

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ؕ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَکّٰی. (طٰہٰ 20:76)

”ہمیشہ رہنے والے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ صلہ ہے اُن کا جو پاکیزگی اختیار کریں۔“

اِس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ اور تزکیہ کا ایک ہی ہدف اور ایک ہی منزل ہے اور وہ منزل جنت ہے۔ تقویٰ اختیار کرنے سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے، جس کا صلہ جنت ہے اور تزکیہ حاصل کرنے

کے لیے تقوے کو اختیار کرنا پڑتا ہے، جس کا آخر الامر انجام جنت کی بادشاہی ہے۔

اس تفصیل سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ روزہ بھی تزکیے کی اُسی منزل تک پہنچاتا ہے، جہاں دیگر عبادات پہنچاتی ہیں۔

روزے سے یہ تقویٰ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ استاذِ گرامی کے نزدیک اِس کو سمجھنے کے لیے تین باتیں پیش نظر رہنی چاہییں:

”پہلی یہ کہ روزہ اِس احساس کو آدمی کے ذہن میں پوری قوت کے ساتھ بیدار کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ نفس کے چند بنیادی مطالبات پر حرمت کا قفل لگتے ہی یہ احساس بندگی پیدا ہونا شروع ہوتا اور پھر بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ روزہ کھولنے کے وقت تک یہ اُس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے۔ فجر سے مغرب تک کھانے کا ایک نوالہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی روزے دار کے حلق سے نہیں گزرتا اور وہ اِن چیزوں کے لیے نفس کے ہر مطالبے کو محض اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل میں پورا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ روزے کا یہ عمل جب بار بار دہرایا جاتا ہے تو یہ حقیقت روزے دار کے نہاں خانۂ وجود میں اتر جاتی، بلکہ اُس کی جبلت میں پیوست ہو جاتی ہے کہ وہ ایک پروردگار کا بندہ ہے اور اُس کے لیے زیبا یہی ہے کہ زندگی کے باقی معاملات میں بھی تسلیم و اعتراف کے ساتھ وہ اپنے مالک کی فرماں روائی کے سامنے سپر ڈال دے اور خیال و عمل، دونوں میں اپنی آزادی اور خود مختاری کے ادعا سے دست بردار ہو جائے۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ خدا پر آدمی کا ایمان ہر لحاظ سے زندہ ایمان بن جاتا ہے، جس کے بعد وہ محض ایک خدا کو نہیں، بلکہ ایک ایسی سمیع و بصیر، علیم و حکیم اور قائم بالقسط ہستی کو مانتا ہے، جو اُس کے تمام کھلے اور چھپے سے واقف ہے اور جس کی اطاعت سے وہ کسی حال میں انحراف نہیں کر سکتا۔ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہی ہے۔

دوسری یہ کہ روزہ اِس احساس کو بھی دل کے اعماق اور روح کی گہرائیوں میں اتار دیتا ہے کہ آدمی کو ایک دن اپنے پروردگار کے حضور میں جواب دہی کے لیے پیش ہونا ہے۔ ماننے کو تو یہ بات ہر مسلمان مانتا ہے، لیکن روزے میں جب پیاس تنگ کرتی، بھوک ستاتی اور جنسی جذبات پوری قوت کے ساتھ اپنی تسکین کا تقاضا کرتے ہیں تو ہر شخص جانتا ہے کہ تنہا یہی احساسِ جواب دہی ہے، جو آدمی کو بطن و فرج کے اِن مطالبات کو پورا کرنے سے روک دیتا ہے۔ رمضان کا پورا مہینا

ہر روز گھنٹوں وہ نفس کے اِن بنیادی تقاضوں پر محض اِس لیے پہرا لگائے رکھتا ہے کہ اُسے ایک دن اپنے مالک کو منہ دکھانا ہے۔ یہاں تک کہ سخت گرمی کی حالت میں حلق پیاس سے چٹختا ہے، برفاب سامنے ہوتا ہے، وہ چاہے تو آسانی سے پی سکتا ہے، مگر نہیں پیتا؛ بھوک کے مارے جان نکل رہی ہوتی ہے، کھانا موجود ہوتا ہے، مگر نہیں کھاتا؛ میاں بیوی جوان ہیں، تنہائی میسر ہے، چاہیں تو اپنی خواہش پوری کر سکتے ہیں، مگر نہیں کرتے۔ یہ ریاضت کوئی معمولی ریاضت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں جواب دہی کا احساس اِس سے دل و دماغ میں پوری طرح راسخ ہو جاتا ہے۔ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے، اگر غور کیجیے تو دوسری موثر ترین چیز یہی ہے۔

تیسری یہ کہ تقویٰ کے لیے صبر ضروری ہے، اور روزہ انسان کو صبر کی تربیت دیتا ہے۔ بلکہ صبر کی تربیت کے لیے اِس سے بہتر اور اِس سے زیادہ موثر کوئی دوسرا طریقہ شاید نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ہم جس امتحان سے دوچار ہیں، اُس کی حقیقت اِس کے سوا کیا ہے کہ ایک طرف ہمارے حیوانی وجود کی منہ زور خواہشیں ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہے کہ ہم اُس کے حدود میں رہ کر زندگی بسر کریں؟ یہ چیز قدم قدم پر صبر کا تقاضا کرتی ہے۔ سچائی، دیانت، تحمل، بردباری، عہد کی پابندی، عدل و انصاف، عفو و درگذر، منکرات سے گریز، فواحش سے اجتناب اور حق پر استقامت کے اوصاف نہ ہوں تو تقویٰ کے کوئی معنی نہیں ہیں، اور صبر کے بغیر یہ اوصاف، ظاہر ہے کہ آدمی میں کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتے۔“ (میزان 364-363)

حج و عمرہ کی عبادات ابلیس سے برسرِ جنگ ہونے اور اِس جنگ میں کامیابی کے حصول کا علامتی اظہار ہیں۔ انسان کو دنیوی زندگی میں یہ آزمایش درپیش ہے کہ ابلیس اور اُس کی ذریت پورے لاؤ لشکر کے ساتھ اُسے صراط مستقیم سے بھٹکانے کے لیے سرگرم ہے۔ اُن کا منصوبہ یہ ہے کہ انسانوں کو جنت کی ابدی بادشاہی سے محروم کیا جائے۔ استاذِ گرامی لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آدم کی تخلیق سے اُس کی جو اسکیم دنیا میں برپا ہوئی ہے، ابلیس نے پہلے دن ہی سے اُس کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے: ’قَالَ: فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ. ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ، وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ‘ (بولا: پھر اِس لیے کہ تو نے مجھے گم راہی میں ڈالا ہے، اب میں بھی اولاد آدم کے لیے ضرور تیری سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا۔ پھر اِن کے آگے اور پیچھے،

دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ضرور اِن پر تاخت کروں گا اور تو اِن میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا)۔ قرآن کا بیان ہے کہ ابلیس کا یہ چیلنج قبول کر لیا گیا ہے اور اللہ کے بندے اب قیامت تک کے لیے اپنے اِس ازلی دشمن اور اِس کی ذریت کے ساتھ برسرِ جنگ ہیں۔ یہی اِس دنیا کی آزمایش ہے جس میں کامیابی اور ناکامی پر ہمارے ابدی مستقبل کا انحصار ہے۔‘‘

(میزان 373)

شیطان کا انسان کو گم راہ کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار یہ ہے کہ وہ اُسے بے حیائی اور برائی کی ترغیب دیتا ہے۔ انسان جب اِن میں ملوث ہوتے ہیں تو اُن کا وجود اور ان کا نفس ان آلایشوں سے آلودہ ہو جاتا ہے۔ اِس کے برعکس اگر وہ شیطان کی ترغیبات کو رد کرتے ہیں اور اپنے آپ کو برائیوں سے بچا لیتے ہیں تو اُن کے نفس کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ شیطان بے حیائی اور برائی کی ترغیب دیتا ہے، اِس لیے اللہ نے اُس کے نقشِ قدم پر چلنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ. (النور 21:24)

’’ایمان والو، شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو اور (یاد رکھو کہ) جو شیطان کے نقش قدم پر چلے گا، وہ اپنے ہی کو برباد کرے گا، اِس لیے کہ وہ تو بے حیائی اور برائی ہی کا راستہ سجھاتا ہے۔‘‘

قربانی نماز اور زکوٰۃ کی طرح اللہ کی پرستش کا اظہار ہے۔ اِس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ اِس کے نتیجے میں انسان کے اندر تقوے کی نشو و نما ہوتی ہے، جو اللہ کی خوش نودی کا باعث بنتی ہے۔ قربانی کے گوشت کے حوالے سے اللہ کا ارشاد ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۗؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ. (الحج 37:22)

’’اللہ کو نہ اِن کا گوشت پہنچتا ہے نہ اِن کا خون، بلکہ اُس کو صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔‘‘

امام امین احسن اصلاحی اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

’’مطلب یہ ہے کہ خدا قربانیوں کے گوشت یا خون سے محظوظ نہیں ہوتا، جیسا کہ مشرکین نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ اُس تقویٰ اور اُس اسلام و اخبات سے خوشنود ہوتا ہے، جو اِن قربانیوں

سے اِن کے پیش کرنے والوں کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ قربانیاں پیش کرتے ہوئے اپنے اندر تقویٰ کی یہ روح پیدا کرو۔ اگر یہ چیز نہ پیدا ہوئی تو یہ محض ایک جانور کا خون بہا دینا ہوا، اس کا حاصل کچھ نہیں۔‘‘(تدبر قرآن 5 / 251)

اِس کی حقیقت اپنی جان کو اللہ کے حضور میں پیش کرنا ہے۔ قربانی کے جانور کو اللہ کی راہ میں قربان کر کے اِس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ہم نے اپنی جان کو اللہ کے لیے خاص کر دیا ہے، وہ جب چاہے، اُسے سلب کر لے اور جب چاہے، ہمیں یہ حکم فرمائے کہ ہم اپنی جان کو اُس کی راہ میں قربان کر دیں۔ استاذِ گرامی نے قربانی کی اِس حقیقت کو تفصیل سے واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’اِس کی حقیقت وہی ہے، جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے، جو اُس جانور کے بدلے میں چھڑا لی جاتی ہے، جسے ہم اِس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔ بظاہر یہ اپنے آپ کو موت کے لیے پیش کرنا ہے، لیکن غور کیجیے تو یہ موت ہی حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: ’وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ، بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ‘ (اور جو لوگ اللہ کی اِس راہ میں مارے جائیں، اُنھیں یہ نہ کہو کہ مردہ ہیں۔ وہ مردہ نہیں، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم اُس زندگی کی حقیقت نہیں سمجھتے)۔ قرآن نے ایک جگہ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت کو رکھ کر یہی حقیقت واضح کی ہے کہ نماز جس طرح اللہ کے ساتھ ہماری زندگی ہے، اِسی طرح قربانی اُس کی راہ میں ہماری موت ہے:

قُلْ: اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (الانعام 6:162)	’’کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب اللہ پروردگار عالم کے لیے ہے۔‘‘

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے کی جگہ جانور کی قربانی دیں اور آیندہ نسلوں میں ہمیشہ کے لیے ایک عظیم قربانی کو اُس کی یادگار بنا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ‘ (ہم نے ایک عظیم قربانی کے عوض اسمٰعیل کو چھڑا لیا)۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ ابراہیم کی یہ نذر قبول کر لی گئی ہے اور اب نسلاً بعد نسلٍ لوگ اپنی قربانیوں کے ذریعے سے اِس واقعے کی یاد قائم رکھیں گے۔

اِس لحاظ سے دیکھیے تو قربانی پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی

طرف کر کے 'بِسْمِ اللّٰہِ، وَاللّٰہُ اَکْبَرُ' کہہ کر، ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔

یہی نذر اسلام کی حقیقت ہے، اِس لیے کہ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ سر اطاعت جھکا دیا جائے اور آدمی اپنی عزیز سے عزیز متاع، حتیٰ کہ اپنی جان بھی اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ قربانی، اگر غور کیجیے تو اِسی حقیقت کی تصویر ہے۔" (میزان 304-303)

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(6)

وَ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ ۚ وَ مَا یَكۡفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۹۹﴾ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوۡا عَهۡدًا نَّبَذَهٗ فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

وَ لَمَّا جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ نَبَذَ فَرِیۡقٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ ۘ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ كَاَنَّهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ اتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّیٰطِیۡنُ عَلٰی مُلۡكِ سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَیۡمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ كَفَرُوۡا یُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ ۗ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلَی الۡمَلَكَیۡنِ بِبَابِلَ هَارُوۡتَ وَ مَارُوۡتَ ؕ وَ مَا یُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوۡلَاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ فَلَا تَكۡفُرۡ ؕ

اور (اِس قرآن کی صورت میں، اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف نہایت واضح دلیلیں اتار دی ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اُنھیں صرف اِس طرح کے نافرمان ہی نہیں مانتے۔ کیا یہی ہوتا رہے گا کہ یہ جب کوئی عہد باندھیں گے، اِن میں سے ایک گروہ اُسے اٹھا کر پھینک دے گا؟ بلکہ (حق یہ ہے کہ) اِن میں سے اکثر تو ایمان ہی نہیں رکھتے۔ 99-100

اور (اب بھی یہی ہوا ہے کہ) جب اللہ کی طرف سے ایک پیغمبر اُن پیشین گوئیوں کے مطابق اِن کے پاس آ گیا ہے جو اِن کے ہاں موجود ہیں تو یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی، اِن میں سے ایک گروہ

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

نے اللہ کی اِس کتاب کو اِس طرح اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا، گویا وہ اِسے جانتے ہی نہیں۔ اور (پیغمبر کو ضرر پہنچانے کے لیے) اُس چیز کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان کی بادشاہی کے نام پر شیاطین پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ (یہ اُسے سلیمان کی طرف منسوب کرتے ہیں)، دراں حالیکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا، بلکہ اِسی طرح کے شیطانوں نے کفر کیا۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور اُس چیز کے پیچھے لگ گئے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت وماروت پر اتاری گئی تھی، دراں حالیکہ وہ دونوں اُس وقت تک کسی کو کچھ نہ سکھاتے تھے، جب تک اُسے بتا نہ دیتے کہ ہم تو صرف ایک آزمایش ہیں، اِس لیے تم اِس کفر میں نہ پڑو۔ پھر بھی یہ اُن سے وہ علم سیکھتے تھے جس سے میاں اور بیوی میں جدائی ڈال دیں، اور حقیقت یہ تھی کہ اللہ کی اجازت کے بغیر یہ اُس سے کسی کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکتے تھے۔ (یہ اِس بات سے واقف تھے) اور اِس کے باوجود وہ چیزیں سیکھتے تھے جو اِنھیں کوئی نفع نہیں دیتی تھیں، بلکہ نقصان پہنچاتی تھیں، دراں حالیکہ یہ جانتے تھے کہ جو اِن چیزوں کا خریدار ہے، اُس کے لیے پھر آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں اِنھوں نے اپنی جانیں بیچ دیں۔ اے کاش، یہ جانتے۔ 102-101

اور اگر یہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں جو صلہ اِنھیں ملتا، وہ (اِن کے لیے) کہیں بہتر تھا۔ اے کاش، یہ سمجھتے۔ 103

اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَکُمۡ کَمَا سُئِلَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَ مَنۡ یَّتَبَدَّلِ الۡکُفۡرَ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ﴿۱۰۸﴾

وَدَّ کَثِیۡرٌ مِّنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ لَوۡ یَرُدُّوۡنَکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ اِیۡمَانِکُمۡ کُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِہِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡحَقُّ ۚ فَاعۡفُوۡا وَ اصۡفَحُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۱۱۰﴾

(اِن کے فتنوں سے بچنے کے لیے)، ایمان والو، (تم بارگاہِ رسالت میں بیٹھو تو) 'رَاعِنَا' نہ کہا کرو، 'اُنْظُرْنَا' کہا کرو اور جو کچھ کہا جائے، اُسے توجہ سے سنو، اور اِس بات کو یاد رکھو کہ اِن کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اہل کتاب ہوں یا مشرکین، اِن میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے، وہ نہیں چاہتے کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے کوئی خیر تم پر نازل کیا جائے۔ (یہ احمق نہیں جانتے کہ) اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے، اور (نہیں جانتے کہ) اللہ بڑی عنایت فرمانے والا ہے۔ 104-105

(اِنھیں اعتراض ہے کہ تورات کی شریعت میں ہم کوئی تبدیلی کیوں کرتے ہیں؟ اِنھیں بتا دو کہ) ہم (اِس کتاب کی) جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں یا اُسے بھلا دیتے ہیں، (قرآن میں) اُس کی جگہ اُس سے بہتر یا اُس جیسی کوئی دوسری لے آتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے، (لوگو) کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے؟ (وہ جس کو چاہے گا، اپنی شریعت کا حامل بنائے گا)، اور (تم اگر اُس کا یہ فیصلہ نہیں مانتے تو) اللہ کے سوا تمھارے لیے (اِس دنیا میں پھر) کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مدد کرنے والا۔ 106-107

(اِن کی پیروی میں، ایمان والو)، کیا تم بھی اپنے رسول سے اُسی طرح کی باتیں پوچھنا چاہتے ہو، جس طرح کی باتیں اِس سے پہلے موسیٰ سے پوچھی گئی تھیں؟ (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ایمان کا طریقہ نہیں ہے) اور (معلوم ہونا چاہیے کہ) جس نے ایمان کے بدلے میں کفر کو لے لیا، وہ پھر سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔ 108

بہت سے اہل کتاب محض اپنے جی کے حسد کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ تمھارے ایمان لانے

کے بعد وہ پھر تمھیں کفر کی طرف پلٹا دیں، اِس کے باوجود کہ حق اُن پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔ سو اُن سے درگذر کرو اور نظر انداز کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔ بے شک، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور (اُن کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے) نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اور (یاد رکھو کہ) جو نیکی بھی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے، اُسے تم اللہ کے ہاں پا لو گے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔ 109-110

[باقی]

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، اُن میں سے سب سے زیادہ فضیلت کی چیز یہ کہنا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور سب سے کم تر یہ ہے کہ راستے میں پڑی ہوئی کوئی ہڈی ہٹا دی جائے۔ حیا بھی ایمان ہی کی ایک شاخ ہے۔ (ابو داؤد، رقم 4058)

— 2 —

حضرت سالم بن عبد اللہ اپنے والد عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر کسی انصاری کے پاس سے ہوا، وہ اپنے بھائی کو حیا کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: اِسے چھوڑ دو، اِس لیے کہ حیا ایمان ہی کا حصہ ہے۔ (بخاری، رقم 23)

— 3 —

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیا ایمان ہی کا جز ہے، اور ایمان کا صلہ جنت ہے۔ اور فحش گوئی نری بد اخلاقی ہے اور بد اخلاقی دوزخ میں لے جائے گی۔ (مسند احمد، رقم 10292)

مقامات

جاوید احمد غامدی

شعلہ و نشیمن

پچھلے چند مہینوں میں مجھے دو مرتبہ اپنا مکان بدلنا پڑا۔ نیو گارڈن ٹاؤن سے اٹھے ہوئے ابھی بہ مشکل پندرہ بیس ہفتے ہوئے تھے کہ اقبال ٹاؤن میں نئے گھر کے مالک نے اُسے بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔ گویا وہی معاملہ ہوا کہ:

آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

میں نے اِس مکان کی تلاش اور اِسے رہنے کے قابل بنانے میں بڑی محنت اٹھائی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مجھے اتنی جلدی یہاں سے اٹھنا پڑے گا۔ گھر کے مالک کو بھی اِس کا احساس تھا۔ اُس نے بڑی ندامت کے ساتھ اپنی مجبوری کا ذکر کیا۔ میں انکار کر دیتا تو وہ یقیناً خاموش ہو جاتا۔ مجھے خیال ہوا، شعلہ و نشیمن کو جمع کرنے میں جو مزہ ہے، وہ اُس عافیت میں ہر گز نہ ہو گا جو انکار کی صورت میں مجھے یہاں میسر رہے گی۔ میں نے گھر خالی کر دینے کا وعدہ کر لیا:

از بہر آشیانہ خس اندوزیم نگر
باز ایں نگر کہ شعلہ در گیرم آرزوست

پچھلے پندرہ برسوں میں، میں نے کئی مکان بدلے ہیں۔ دوسرے کا گھر ایک دن آدمی کو خالی

کرنا ہی پڑتا ہے۔ مجھے جب کبھی گھر کا مالک اپنا گھر چھوڑنے کے لیے کہتا ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ایک بڑی حقیقت کی یاددہانی ہے۔ اِس دنیا میں ہم جس کے گھر میں رہ رہے ہیں، وہ بھی ایک دن یقیناً اِسے چھوڑنے کے لیے کہے گا۔ ہم اِس مالک سے تکرار کر سکتے ہیں، اُس کے سامنے اِس کا بھی امکان نہیں۔ یہاں ہم اپنا سب ساز و برگ ساتھ لے جا سکتے ہیں، وہاں یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ ایک دن اُس کا گھر خالی کر دیں اور ہم نے اُسے جس طرح استعمال کیا ہے، اُس کے لیے اُس کے سامنے مسؤل ٹھیرائے جائیں۔ یہ اِس عالم کی سب سے بڑی حقیقت ہے جس سے کسی کے لیے مفر نہیں۔ یہاں ہر حادثہ دراصل اِسی حقیقت کی یاددہانی ہے:

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث، مکتب
لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں

[1986ء]

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(7)

—3—

انفس و آفاق میں
نبیوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

اللہ کی آیات کی تیسری صورت وہ خارقِ عادت اور خلافِ معمول نشانیاں ہیں، جنھیں اللہ اپنے نبیوں کو عطا فرماتا ہے۔ حقیقت میں یہ اُسی طرح کے حیرت انگیز اور عقل کو عاجز کر دینے والے

احوال ہیں، جو دستِ قدرت سے براہِ راست ظاہر ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اِن کے ظہور میں انبیا کا توسط اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ معاملات کی باگ گویا پیغمبر کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ چنانچہ عالم شہود میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، اُسی کی وساطت اور اُسی کے توسل سے ہوتا ہے۔ اِس کی ایک دل نواز مثال اللہ تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا درجِ ذیل حکم ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ. وَاتْرُکِ الْبَحْرَ رَھْوًا ؕ اِنَّھُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ. (الدخان 44: 23-24)

”اچھا تو میرے بندوں کو رات ہی رات میں لے کر نکل جاؤ اور آگاہ رہو کہ تمھارا پیچھا کیا جائے گا۔ اور ہاں، دریا (سے گزرنے کے بعد اُس) کو پر سکون چھوڑ دینا۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ یہ لوگ اب غرق ہونے والا لشکر ہیں۔“

مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو لے کر نکل جانے کے بعد اپنے عصا کے ذریعے سے دریا کو برابر پر سکون کرتے جانا۔ استاذِ گرامی اِس حکم کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”قرآن اور بائیبل، دونوں میں تصریح ہے کہ دریا کا پانی موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کے گزرنے کے لیے تند ہواؤں کے ذریعے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ یہ حکم اِسی بنا پر دیا گیا اور اِس کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے گزرتے ہی وہ ہٹا ہوا پانی واپس آ کر فرعون اور اُس کی فوجوں پر چھا گیا، جو اُس وقت بنی اسرائیل کا تعاقب کرتے ہوئے دریا کے بیچ میں پہنچ چکی تھیں۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو حکم کا اسلوب ایسا ہے کہ گویا دریا اُس وقت پیغمبر کے اختیار میں دے دیا گیا تھا، جسے اگر پر سکون ہونا تھا تو اُسی کی اجازت سے ہونا تھا۔“ (البیان 4 / 483-484)

انبیا کے ذریعے سے ظاہر ہونے والی یہی آیات ہیں، جنھیں اصطلاح میں معجزات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[1] اِن کی حیثیت بینات یعنی روشن و رخشاں دلائل کی ہوتی ہے، جو عارف و عامی اور حامی و

[1] ۔ واضح رہے کہ قرآنِ مجید میں معجزے کی اصطلاح اختیار نہیں کی گئی۔ وہاں اِس مفہوم کے لیے آیت ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ معجزے کے مفہوم پر مفصل معلومات کے لیے اِسی تصنیف میں ضمیمہ 1 ملاحظہ

مخالف، سب کے لیے یکساں معتبر ہوتے ہیں۔ ایمان کی نعمت سے فیض یاب عاقل اور سلیم الطبع لوگ اِن کا تقاضا نہیں کرتے، تاہم یہ اُن کے لیے انعام و اکرام یا ازدیادِ ایمان کا باعث بنتے ہیں۔ منکرین اور معاندین اِن کے طلب گار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق اُن کی تذکیر و تنبیہ یا تادیب و تعذیب کے لیے اِنھیں نازل فرماتے ہیں۔

استاذِ گرامی نے اِس امر کی وضاحت میں لکھا ہے:

”نبی کی شخصیت انسانیت کا مظہرِ اتم اور اُس کی دعوت انسان کی فطرت پر مبنی ہوتی ہے... وہ لوگوں سے جو کچھ کہتا ہے، عقل و بصیرت کے آخری معیار پر کہتا ہے اور اُنھی چیزوں کے بارے میں کہتا ہے، جن سے انسان غافل ہوتا یا اُنھیں بھلا بیٹھتا ہے۔ پھر اُس کی نبوت کے پیچھے اخذ و اکتساب کا کوئی پس منظر بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اُس کو پہچاننے میں کسی سلیم الفطرت شخص کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ انسان کے دل و دماغ بیدار ہوں تو روے و آواز پیمبر معجزہ ست۔

تاہم اِس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اُس کو ایسی بینات بھی عطا فرماتے ہیں کہ معاندین اگرچہ زبان سے اقرار نہ کریں، لیکن اُس کی صداقت پر یقین کے سوا اُن کے لیے بھی کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔“ (میزان 133-134)

اِن آیات یا معجزات کی نوعیت اور حقیقت کے بارے میں قرآنِ مجید سے جو رہنمائی ملتی ہے، وہ چند نکات میں درجِ ذیل ہے۔

اولاً، اِن معجزات کا ظہور اگرچہ انبیا کے ذریعے سے ہوتا ہے، مگر یہ سر تا سر من جانبِ اللہ ہوتے ہیں۔ اِن کی نوعیت، اِن کے اثر اور موقع و مقام کا فیصلہ اللہ کے اذن پر منحصر ہوتا ہے۔ انبیا و رسل اِنھیں اُسی وقت ظاہر کرتے ہیں، جب اُنھیں اللہ کا حکم ہو۔ اِن کے ظہور اور وقوع میں نبی کا کام فقط یہ ہوتا ہے کہ وہ مثال کے طور پر اپنا عصا پتھر پر مارے یا اُسے زمین پر ڈال دے یا مٹھی بھر ریت کو کفار کے لشکر کی طرف پھینکے یا منزل من اللہ کلام کی تلاوت کا فریضہ انجام دے۔ سورۂ مائدہ (5) میں اللہ تعالیٰ نے قیامت میں پیش آنے والے اُس واقعے کو بیان فرمایا ہے کہ جب نصاریٰ پر اتمام حجت کے لیے سیدنا مسیح علیہ السلام کو عطا کیے گئے معجزات کا ذکر کیا جائے گا۔ اُس موقع پر

کیجیے۔

'بِاِذْنِیْ' (میرے حکم سے) کے الفاظ کو بار بار دہرایا جائے گا۔ اِس سے مقصود یہ باور کرانا ہو گا کہ جن معجزات کو بنیاد بنا کر اُنھوں نے مسیح کو اللہ کی الوہیت میں شریک کیا، وہ اللہ ہی کی جانب سے تھے اور اُسی کے حکم پر مبنی تھے۔ نصاریٰ نے اُنھیں حضرت مسیح سے منسوب کر کے ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ ارشاد فرمایا ہے:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَ عَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ .	”جب اللہ کہے گا: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ، میری اُس عنایت کو یاد کرو، جو میں نے تم پر اور تمھاری ماں پر کی تھی، اُس وقت، جب میں نے روح القدس سے تمھاری مدد کی، تم گہوارے میں بھی (اپنی نبوت کا) کلام کرتے تھے اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی۔
وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ .	اور اُس وقت، جب میں نے تمھیں قانون اور حکمت سکھائی، یعنی تورات و انجیل کی تعلیم دی۔ اور اُس وقت، جب تم میرے حکم سے پرندے کی ایک صورت مٹی سے بناتے تھے، پھر اُس میں پھونکتے تھے اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے۔
وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ. (110:5)	اور اُس وقت، جب تم مردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے۔ اور اُس وقت، جب میں نے بنی اسرائیل کے ہاتھ تم سے روک دیے، جب تم کھلی

ہوئی نشانیاں لے کر اُن کے پاس آئے
اور اُن کے منکروں نے کہا کہ کچھ نہیں،
یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔‘‘

امام امین احسن اصلاحی اِس مقام کی تفسیر میں اللہ کے اذن کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’یہ تمام باتیں قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نصاریٰ پر حجت تمام کرنے کے لیے فرمائے گا۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے گی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ پر جو انعام بھی ہوا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا، اُنھوں نے جو معجزے بھی دکھائے، سب اللہ کے اذن و حکم سے دکھائے اور یہودیوں نے اُن کو جن خطرات میں ڈالا، اُن سے اُن کو اللہ تعالیٰ ہی نے نکالا۔ پھر جب یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے کیا اور اِس کے سب سے بڑے گواہ خود عیسیٰ ہیں تو نصاریٰ بتائیں کہ اُنھوں نے کس کے کہنے سے اُن کو خدا بنا ڈالا؟ یہاں ’بِاِذْنِیْ‘ (میرے حکم سے) کی تکرار نہایت بلیغ ہے۔ ایک ایک بات پر اللہ تعالیٰ اِس کو دہرائے گا اور اِن میں سے ہر بات پر سیدنا مسیح علیہ السلام ’اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا‘ ہی کہیں گے تو ظاہر ہے کہ جن معجزات کے بل پر نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنایا، جب وہ سب خدا کے ’اذن‘ سے ہوئے اور اُس کا اعتراف خود معجزات کا دکھانے والا ہی کرے گا تو نصاریٰ کے حصے میں فضیحت اور رسوائی کے سوا اور کیا باقی رہ جائے گا؟‘‘ (تدبر قرآن 2/607)

ثانیاً، اِنھیں علم و ہنر کا کمال نہیں سمجھا جا سکتا۔ نہ اِنھیں شعبدہ اور فریبِ نظر قرار دے کر رد کرنا ممکن ہوتا ہے اور نہ سحر و ساحری کہہ کر قبول کرنے سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ اِن چیزوں کے ماہرین بھی اِن کی صحت اور قطعیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اخذ و اکتساب کی سطح سے بلند اور سحر و ساحری سے ماورا کوئی منفرد معاملات ہیں۔ استاذِ گرامی لکھتے ہیں:

’’اِن معجزات کو کوئی شخص سحر و ساحری یا علم و فن کا کمال کہہ کر رد نہیں کر سکتا، اِس لیے کہ اِس طرح کے علوم و فنون کی حقیقت اُس کے ماہرین سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا اور وہ بھی اُن کے سامنے اعترافِ عجز پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے جن دو معجزات کا ذکر اوپر

ہوا ہے، اُن کا اثر مٹانے کے لیے فرعون نے یہی امتحان کیا تھا۔ قرآن کا بیان ہے کہ اُس نے تمام مملکت میں ہرکارے بھیج کر ماہر جادوگر بلائے اور میلے کے دن اُنھیں مقابلے کے لیے پیش کر دیا۔ اُس نے یہ اہتمام فتح کی توقع میں کیا تھا، لیکن ہوا یہ کہ جادوگروں نے عصاے موسوی کو اپنا طلسم نگلتے دیکھا تو بے اختیار سجدہ ریز ہو گئے اور اعلان کر دیا کہ وہ موسیٰ وہارون کے رب پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ ایمان چونکہ حقیقت کو بہ چشم سر دیکھ لینے سے پیدا ہوا تھا، اِس لیے ایسا راسخ تھا کہ فرعون نے جب اُنھیں دھمکی دی کہ میں تمھارے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دوں گا اور تمھیں کھجور کے تنوں پر سر عام سولی کے لیے لٹکا دوں گا تو وہی جادوگر جو چند لمحے پہلے بڑی لجاجت کے ساتھ اُس سے انعام کی درخواست کر رہے تھے، پکار اٹھے کہ ماہِ نخشب اور خورشیدِ جہاں تاب کا یہ فرق دیکھ لینے کے بعد اب ہمیں کسی چیز کی کوئی پروا نہیں ہے:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا. اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى.

(طٰہٰ 20: 72-73)

”جادوگروں نے جواب دیا: ہم اُن روشن نشانیوں پر ہرگز تم کو ترجیح نہ دیں گے، جو ہمارے سامنے آچکی ہیں اور نہ اُس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ اِس لیے تمھیں جو کرنا ہے، کر گزرو۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو، اِسی دنیا کی زندگی کا کر سکتے ہو۔ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں، اِس لیے کہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اُس جادو کو بھی معاف فرمائے، جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا ہے۔ اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔“

(میزان 136)

ثالثاً، اِن معجزات کا ایک بڑا مقصد منکرین اور معاندین پر اتمام حجت ہوتا ہے۔ یعنی جو لوگ عقل و فطرت کے دلائل پر دھیان نہیں دے رہے اور بلا جواز نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں، اُن کے پاس حق سے انحراف کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ چنانچہ اِن کے ظہور کے بعد منکرین کے

لیے انکار کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ وہ اگر زبان سے اِنھیں جھٹلا بھی رہے ہوں، مگر اُن کے دل و دماغ اِن کے اقرار پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ اظہر من الشمس ہوتے اور ہر عام و خاص کے لیے یکساں لائق حجت ٹھہرتے ہیں۔ اتمام حجت کا ایک پہلو منکرین کو ایمان لانے کا مزید موقع دینا بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب منکرین پیغمبر سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور اُس کے روبرو اِس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو، وہ اگر درست ہے تو پھر اُس عذاب کو لے آؤ، تو اِس کے جواب میں عذاب کے بجاے حسی معجزات دکھا کر اُنھیں عذاب کے یقینی ہونے کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے رحمت کا ظہور ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی آنکھیں عقل و فطرت کے بین دلائل سے نہیں کھلیں، ممکن ہے کہ اِن غیر معمولی واقعات کو دیکھ کر کھل جائیں اور وہ ایمان لانے پر آمادہ ہو جائیں۔ اِس کی مثال قوم ثمود میں اونٹنی کا ظاہر ہونا ہے۔ امام امین احسن اصلاحی اِس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”یہ اونٹنی قوم کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ایک نشانی عذاب کی حیثیت سے نام زد کی گئی تھی۔ چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ جب ثمود کے لیڈر نے اِس کی کونچیں کاٹ دیں تو اِس کے تیسرے دن عذاب الٰہی آدھمکا۔...
>
> مطالبۂ عذاب کے جواب میں عذاب کے بجاے ایک نشانی عذاب کی نام زدگی اللہ تعالیٰ کی رحمت و رافت کی دلیل تھی۔ وہ قہر میں دھیما اور رحمت میں جلدی کرنے والا ہے۔ اِس وجہ سے اُس نے یہ پسند فرمایا کہ لوگوں کو مزید مہلت دے کہ اب بھی وہ متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں، لیکن اُنھوں نے متنبہ ہونے کے بجاے جسارت کا آخری قدم اٹھا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔“ (تدبر قرآن 3/ 301-302)

[باقی]

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے نقاب کرے

ڈاکٹر عرفان شہزاد

تعلیم کا کاروبار

[”نقد و نظر“ کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

عوام، بشمول تعلیم یافتگان میں بالعموم یہ خیال پایا جاتا ہے کہ تعلیم ایک مقدس فریضہ ہے، اسے کاروبار بنالینا کوئی قابل تحسین کام نہیں۔ نیز، یہ پیغمبروں کا پیشہ ہے، اس لیے اوّلاً تو اس کی کوئی اجرت ہی نہیں ہونی چاہیے اور ہو بھی تو قدرِ ضرورت سے زائد نہ ہو۔ نجی تعلیمی اداروں کی بھاری فیسیں اسی لیے ہدف تنقید بنتی ہیں۔

اس کے برعکس، حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کا کام خدا کا دین لوگوں تک پہنچانا اور اس کی تعلیم دینا تھا، سائنسی اور سماجی علوم اور پیشہ ورانہ مہارتوں کی تعلیم پیغمبروں کا کام نہیں رہا۔ اس قسم کے علوم و فنون کے لیے انھیں بھی دوسروں کی مدد درکار ہوتی تھی، جس کا معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ جنگِ بدر کے غیر مسلم قیدیوں میں سے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان سے مسلم بچوں کو کتابت سکھائی گئی تھی اور یہی ان کی رہائی کا معاوضہ قرار پایا تھا۔

خدا کے پیغمبر جنھیں ان کی دینی مصروفیات کی وجہ سے کسبِ معاش سے آزاد رکھا گیا تھا، ان

کی معاش کا انتظام بھی خدا کی اسکیم میں موجود تھا۔ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ [1] اور مال فے [2] (جو جنگ میں لڑے بغیر ہاتھ آ جائے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص تھا۔ جسے آپ اپنے اہل خانہ اور سماج کے دیگر ضرورت مندوں کے مصارف میں خرچ کیا کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کے ہاں اللہ تعالیٰ نے یہ دستور رکھا تھا کہ ان کے دینی امور کے نگران بنی لاوی کے اخراجات پورے کرنا قوم کی اجتماعی ذمہ داری تھی۔ عام لوگوں کی معاش کے لیے ایسا کوئی خدائی انتظام نہیں کیا گیا۔ لہٰذا دین کی تعلیم و تدریس کے لیے بھی خدمات کا معاوضہ وصول کرنے میں کوئی حرج نہیں، چہ جائیکہ دنیا سے متعلق امور کی تعلیم کے معاوضے یا کاروبار کو ناقابل رشک نگاہ سے دیکھا جائے۔ یہی بات مبنی بر حقیقت اور قرینِ انصاف ہے۔

جس طرح سستی اور معیاری سفری سہولتیں اور علاج معالجہ کی فراہمی جدید ریاست کی ذمہ داری

---

[1] ۔ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. (الانفال 41:8)

"(تم نے پوچھا تھا تو) جان لو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا تھا، اُس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے، اُس کے پیغمبر کے لیے، (پیغمبر کے) اقربا اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا۔ (یہ اللہ کا حکم ہے، اِس کی بے چون و چرا تعمیل کرو)، اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اُس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتاری تھی، جس دن دونوں گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی تھی، اور (جان رکھو کہ) اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

[2] ۔ مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ. (الحشر 7:59)

"اِن بستیوں کے لوگوں سے اللہ جو کچھ اپنے رسول کی طرف پلٹائے، وہ اللہ اور رسول اور قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا تاکہ وہ تمھارے دولت مندوں ہی میں گردش نہ کرتا رہے۔ اور رسول (کا منصب یہی ہے کہ) جو تمھیں دے، وہ لے لو اور جس چیز سے روکے، اُس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔"

شمار ہوتی ہے، اسی طرح سستی اور معیاری تعلیم کی فراہمی بھی اس کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ تاہم، تیسری دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی سرکاری تعلیم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ حکومتی ترجیحات میں اس کا نمبر بہت نیچے ہے۔ اس صورت حال میں یہ بالکل فطری بات ہے کہ معیاری تعلیم کی کمی پوری کرنے کے لیے نجی شعبے سے حوصلہ مند اور باصلاحیت افراد آگے آئیں، ایسے ہی جیسے طب اور ٹرانسپورٹ کے میدانوں میں نجی سطح پر افراد، ہسپتال اور کمپنیاں مطلوبہ سہولیات فراہم کرتی اور اس سے مالی فوائد حاصل کرتی ہیں۔

تعلیم و تدریس کے لیے بھی انفراسٹرکچر کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے کسی بھی دوسرے کاروبار کے لیے درکار ہوتی ہے۔ عمارت، اس کا کرایہ، لیبارٹری اور سپورٹس کا سامان، یوٹیلیٹی بلز، اور سب سے بڑھ کر اساتذہ اور دیگر عملے کی تنخواہیں، اس ساری تگ و دو کا اطمینان بخش معاوضہ اور منافع ملنا اخلاقیات کے کسی پیمانے سے غلط نہیں۔ اس لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ تعلیم کا کاروبار بھی ایک درست کاروبار ہے۔ فیس کے لحاظ سے تعلیمی معیار کو یقینی بنانا تعلیمی اداروں کی ذمہ داری ہے اور والدین ان سے جواب دہی کا حق رکھتے ہیں۔

نجی تعلیمی اداروں میں ایک استاد کا تجربہ جتنا زیادہ ہوتا جاتا ہے، اس کی خدمات کی طلب بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اسی تناسب سے تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ بھی اس کا حق بنتا ہے۔ ایثار یا بے غرض خدمات پیش کرنا انفرادی ذوق اور رجحان کا معاملہ ہے، جو چند ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ ایسی کسی انفرادی مثال سے عام لوگوں سے اس کا مطالبہ کرنا بے جا ہے۔ اپنی ضروریات سے بندھے ہوئے عام لوگ عمومی رجحانات کے حامل ہوتے ہیں۔ سماج کو یہ عمومی رجحانات ہی قائم رکھتے ہیں۔ ہر کوئی درویش صفت ہونے لگے تو سماج تباہ ہو جائے۔ پھر ایثار کا مطالبہ صرف استاد یا نجی تعلیمی اداروں کے مالکان ہی سے کیوں؟ یہ مطالبہ ہر اس پیشہ ور سے کیا جا سکتا ہے جس کا پیشہ مقدس سمجھا جاتا ہے، جیسے طب اور عدالت۔ ڈاکٹر اور جج سے بے غرضی کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، اسی طرح اساتذہ اور تعلیمی اداروں کے مالکان سے بھی نہیں کرنا چاہیے۔

تعلیمی اداروں کے یہ اخراجات ہر علاقے اور ہر طبقے کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ طبقات کا یہ فرق جس طرح ریستورانوں، کپڑوں کے برینڈز وغیرہ میں ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح تعلیم کے مختلف معیارات میں بھی اس کا ظاہر ہونا بالکل فطری بات ہے۔

جب تک سرکاری تعلیم کا معیار بلند نہیں ہو جاتا، یہ فیصلہ لوگوں کے وسائل اور ذوق پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ بچوں کو کس قسم کی تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ وسائل کی کمی کے سبب سے معیاری تعلیم نہ دلا سکنا افسوس ناک ہے، مگر اس کا علاج نجی تعلیمی اداروں سے ایثار کے مطالبے میں نہیں، وسائل میں اضافے اور سرکاری اسکولوں کے معیار میں بہتری لانے میں ہے۔

نجی کاروبار کرنا آسان کام نہیں، خصوصاً پاکستان میں جہاں کاروبار کے لیے حالات اکثر غیر یقینیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود کاروبار کی ہمت جٹانے والے داد کے مستحق ہیں۔ تعلیم کو بہ طور کاروبار اختیار کرنے والے ایک بھاری اور نازک ذمہ داری اٹھاتے ہیں، جس میں کسی کوتاہی کی گنجایش نہیں دی جا سکتی۔ انھیں چاہیے کہ اپنا کاروباری فریضہ پوری دیانت داری اور احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کریں۔

ابو سعد اعظمی

قدیم مفسرین کے تسامحات اور مولانا فراہیؒ

(2)

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

6۔ سورۂ نساء، آیت 140 'وَ قَدۡ نَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الۡکِتٰبِ اَنۡ اِذَا سَمِعۡتُمۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکۡفَرُ بِہَا وَ یُسۡتَہۡزَاُ بِہَا فَلَا تَقۡعُدُوۡا مَعَہُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِہٖۤ اِنَّکُمۡ اِذًا مِّثۡلُہُمۡ' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس کا ذکر سورۂ انعام میں ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، لیکن مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت نے سورۂ انعام کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے جیسا کہ ابن جریر نے ذکر کیا ہے حالانکہ اس میں نسخ کی نوعیت کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ آیت مسلمانوں کو ان کے پاس بیٹھنے سے منع کر رہی ہے۔ ایسی حالت میں جب آیات الٰہی کا مذاق اڑایا جا رہا ہو تا آنکہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔''[1]

7۔ نساء، آیت 162 میں وارد ترکیب 'وَ الۡمُقِیۡمِیۡنَ الصَّلٰوۃَ' کا شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے ترجمہ

[1]۔ الفراہی، تعلیقات 1/137۔

کیا"اور آفرین ہے نماز پر قائم رہنے والوں پر"۔[2] ان کی رائے میں 'الْمُقِيْمِيْنَ' مدح کی وجہ سے حالت نصب میں ہے، جیسا کہ سیبویہ کا قول ہے، لیکن خاص مدح کے معنی ضروری نہیں، بلکہ اس سے پہلے "یعنی" مقدر ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ منصوب ہوتا ہے کیونکہ وہ مدح کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ مدح و ذم، دونوں ہی مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔[3]

8۔مائدہ، آیت 36-35 'يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"قربانی بھی فدیہ ہی ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وسیلہ کے معنی پیغمبر کی اطاعت کے ہیں اور اگر کوئی نیک کام محض عقل کے کہنے پر کیا جائے تو وہ اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہے۔[4] یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے، لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے اور نہ اس شبہ کی کوئی گنجایش ہے جس کا ازالہ انھوں نے کرنا چاہا ہے۔ کیونکہ عمل صالح میں پیغمبر کی اطاعت لازمی طور پر شامل ہے، بلکہ پیغمبر مبعوث ہی اس لیے کیے گئے ہیں کہ اس کی دعوت دیں اور اس کی حقیقت اچھی طرح واضح کر دیں۔ چنانچہ جو تفسیر ماقبل و مابعد کے موافق ہو سکتی ہے، وہ یہی ہے کہ بندہ اللہ تک پہنچانے والے اعمال کے ذریعے سے اپنے تقویٰ کو ثابت کرے جو کہ قربانی کی حقیقت ہے۔"[5]

9۔مائدہ، آیت 40 'اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"علامہ عبد القادر دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ اگر چاہے تو چھوٹے گناہ پر بڑا عذاب دے۔ اس کے ایسا کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔[6] یہ آیت کی غلط تاویل ہے۔ کیونکہ

---

[2]۔ دہلوی، شاہ عبد القادر، موضح القرآن، تصحیح و تشریح اخلاق حسین قاسمی 133۔

[3]۔ الفراہی، تعلیقات 1/139۔

[4]۔ دہلوی، عبد القادر، موضح القرآن 145۔

[5]۔ الفراہی، تعلیقات 1/154۔

[6]۔ دہلوی، عبد القادر، موضح القرآن 146۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو عذاب دیتا ہے اور توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔...وہ حاکم مطلق ہے جس طرح عذاب دینے پر قادر ہے، اسی طرح بخشنے پر بھی قادر ہے۔ یہ تاویل نظم کلام کے موافق ہے۔"[7]

10۔ سورۂ انعام، آیت 19 'وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ' میں وارد جملہ 'وَمَنۡۢ بَلَغَ' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"امام رازی کا خیال ہے کہ 'وَ مَنۡۢ بَلَغَ' سے مراد وہ شخص ہے جو بلوغت کی عمر کو پہنچ جائے۔ اس مفہوم کو مراد لینے کی صورت میں ضمیر کے لوٹانے کا مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا۔[8] امام رازی کی یہ تاویل انتہائی کمزور ہے۔ آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ میں تم کو خبردار کروں اور جن کو یہ قرآن پہنچے وہ اس کے ذریعے سے اپنی قوم اور اپنے ساتھیوں کو خبردار کریں، جیسا کہ سورۂ توبہ، آیت 122 میں فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو تبلیغ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا 'فلیبلغ الشاھد الغائب'۔ معلوم ہوا کہ امت پر فریضۂ تبلیغ نص قطعی سے ثابت ہے۔ زیادہ تر مفسرین نے 'وَ مَنۡۢ بَلَغَ' کا یہی مفہوم مراد لیا ہے کہ میں ان لوگوں کو انذار کروں جن تک یہ قرآن پہنچے۔"[9]

یہاں علامہ فراہی نے امام رازی کی تاویل کو انتہائی کمزور قرار دیا ہے۔ تفسیر رازی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام رازی نے مذکورہ رائے کو آیت کی تشریح کے ضمن میں ذکر ضرور کیا ہے، لیکن وہ خود اس رائے کو مرجوح قرار دیتے ہیں اور جمہور مفسرین نے آیت کا جو مفہوم مراد لیا ہے وہ ان کے نزدیک بھی راجح ہے۔[10] شاید یہی وجہ ہے کہ تعلیقات کے اردو ترجمہ میں یہاں سے بھی امام رازی کے مذکورہ قول کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا گیا۔[11]

---

[7]۔ الفراہی، تعلیقات 155/1۔

[8]۔ الرازی، التفسیر الکبیر 12/178۔

[9]۔ الفراہی، تعلیقات 1/179۔

[10]۔ الرازی، التفسیر الکبیر 12/178۔

[11]۔ فراہی، قرآنی حواشی 136۔

11۔ انعام، آیت 126 'وَ ھٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"علامہ عبد القادر فرماتے ہیں کہ "صراط مستقیم" سے مراد اطاعت کا اقرار اور عقل کو نظر انداز کرنا ہے"۔ یہ تاویل صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر صراط مستقیم توحید کے لیے مستعمل ہوا ہے۔ یہاں یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے لیے اطاعت کو خالص کرنے کے مفہوم میں آیا ہے... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومن کی عقل معطل نہیں ہوتی، بلکہ صحیح رخ پر کام کرتی رہتی ہے۔"[12]

مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی موضح قرآن کے حاشیہ میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ غیبی امور میں ایمان بالغیب کافی ہے، عقل کو دخل نہیں۔ رہے احکام شریعت تو ان میں مصلحتیں اور حکمتیں بے شمار ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے عقل و فہم سے کام لینا قرآن کریم کا حکم ہے۔ 'افلا تعقلون؟'، 'افلا تتفکرون؟' شاہ ولی اللہ صاحب نے "حجۃ اللہ البالغہ" کے مقدمہ میں اسرار دین کی حکمتوں پر غور و فکر کرنے کی ضرورت پر بڑی محققانہ بحث کی ہے۔[13]

12۔ اعراف 127 'وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ يَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"'اٰلِهَة' سے مراد فرعون کے وہ بت ہیں جنھیں اس نے اپنی رعایا کے لیے نصب کرایا تھا تاکہ ان کے آگے سجدہ ریز ہوں اور اس طرح اس کی بڑائی کا اظہار کریں۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس کی واقعاتی شہادت تاریخ سے ملتی ہے اور اس سے وہ اشکال رفع ہو جاتا ہے جس میں امام رازی جیسے مفسر پڑنے سے نہیں بچے۔[14] اور حضرت حسن، زمخشری اور ابو بکر انباری رحمہم اللہ سے اس معاملہ میں غلطی ہوئی ہے۔ اشکال کی وجہ یہ ہوئی کہ انھوں نے 'اٰلِهَتَكَ' کا جو مفہوم سمجھا جو فرعون کے اس قول کے خلاف تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے کہ اس نے کہا 'مَا

---

[12]۔ الفراہی، تعلیقات 1/198۔

[13]۔ دہلوی، عبد القادر، موضح القرآن 185۔

[14]۔ الرازی، التفسیر الکبیر 14/211۔

عَلِمۡتُ لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرِیۡ ‘ نیز کہا ’ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی ‘ ۔“[15]

13۔ سورۂ توبہ، آیت 112 میں وارد لفظ ’ السّآئِحُوۡنَ ‘ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

”عام مفسرین کے نزدیک اس کے معنی روزہ دار کے ہیں۔ حضرت عکرمہ اور وہب بن منبہ نے اس سے طلب علم کے لیے سفر کرنے والوں کو مراد لیا ہے۔ ابو مسلم کا خیال ہے کہ جہاد کے لیے تگ و دو کرنے والے مراد ہیں۔ لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ سورۂ تحریم، آیت 5 میں یہ لفظ عورتوں کے ایک وصف کے طور پر آیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی آیات پر غور و فکر کرنے والوں کے لیے استعمال ہوا ہو۔ نظم کلام سے بھی اس مفہوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔“[16]

14۔ سورۂ ہود، آیت 101 ’ وَمَا ظَلَمۡنٰھُمۡ وَلٰکِنۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَھُمۡ ‘ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

”اس آیت اور اس کے مشابہ دوسری آیتوں کے بعد کوئی شخص کیسے شک کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ اس کا رویہ بخشش اور کرم کا ہے۔ اور اسی کا ہمیں بھی حکم دیا ہے۔ لیکن بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی فعل ظلم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ مختار کل ہے۔ اگر وہ تمام مخلوق کو بغیر ان کے گناہ کیے عذاب دے یا بغیر کسی نیک کام کے ان کو انعام سے نوازے تو یہ اس کی طرف سے ظلم نہیں ہو گا۔ بلاشبہ یہ کہنے میں ان کی نیت خیر کی ہے۔ لیکن اللہ ان پر رحم کرے کہ انھوں نے اسے عقیدہ بنا کر اللہ کی وہ قدر نہیں کی جس کا کہ وہ حق دار ہے۔ جب ان کے سامنے یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں چھوٹے بچوں اور جانوروں کو کیسے تکلیف میں رکھتا ہے تو وہ یہ کہہ کر اسے جائز ٹھہراتے ہیں کہ اگر وہ کسی مصلحت اور رحمت کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے بھی ایسا کرتا ہے تو وہ ظلم نہیں ہو گا، اور اس نے ایسا کیا بھی ہے۔

یہ جواب خلاف قرآن، اس کی آیتوں سے متناقض اور خدائے رؤف و رحیم کے ساتھ بدگمانی ہے۔ وہ ایک ایسی بات کے قائل ہیں جس سے بعض مشرکین کے ظالم اور شر برپا کرنے

---

[15]۔ الفراہی، تعلیقات 1/ 224۔

[16]۔ ایضاً 18252۔

والے خدا اور ہمارے عادل، بخشنے والے، نیکیوں کو قبول کرنے والے، محبت کرنے والے اور رحم فرمانے والے خدا کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ دین کے لیے اس سے زیادہ ضرر رساں چیز کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ اللہ کے بارے میں غلط بات کہی جائے اور اس پر افترا پردازی کی جائے۔ صالحین، چھوٹے بچوں اور حیوانات کو جو تکلیفیں لاحق ہوتی ہیں، اس کا جواب اس کے محل میں تفصیل سے دیا جا چکا ہے۔ پھر جس بات کا علم آپ کو نہ ہو اسے اللہ کی طرف کیوں نہیں پھیر دیتے جیسا کہ قرآن میں روح سے متعلق سوال کے جواب میں فرمایا ہے۔ کسی بات کے جواب میں "لا ادری" (میں نہیں جانتا) کہنا زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔"[17]

15۔ سورۂ یوسف کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

"ہمارے علماے تفسیر پر دونوں پیغمبروں (حضرت یوسف علیہ السلام اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان مطابقت کا یہ پہلو مخفی نہیں تھا... ابن جریر کی یہ تفسیر اس سے قریب ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ البتہ مشرکین کو اس آیت کا مخاطب قرار دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ سورہ کے آغاز میں صریح طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور آخر میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یہ قصہ اہل عقل کے لیے عبرت حاصل کرنے کی غرض سے بیان کیا گیا ہے۔"[18]

16۔ سورۃ الرعد، آیت 11 میں وارد لفظ 'مُعَقِّبٰتٌ' کی تشریح میں امام رازی پر تنقید کرتے ہوئے مولانا فراہی لکھتے ہیں:

"امام رازی نے 'مُعَقِّبٰتٌ' کے معنی رات اور دن میں یکے بعد دیگرے رکھوالی کرنے والے فرشتے بتائے ہیں، لیکن یہ رائے مجھے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔"[19]

امام رازی نے اس ضمن میں دو قول نقل کیے ہیں۔ اول الذکر جس کو امام فراہی نے صحیح نہیں قرار دیا ہے، اسے وہ جمہور کے قول کی حیثیت سے نقل کرتے ہیں جب کہ ابن عباس رضی اللہ

---

[17]۔ ایضاً 1/290۔

[18]۔ ایضاً 1/297۔

[19]۔ ایضاً 1/314۔

عنہ کے حوالہ سے انھوں نے اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی نقل کیا ہے۔[20] یہاں امام فراہی نے امام رازی کی مذکورہ رائے کے سلسلہ میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار تو کر دیا ہے، لیکن اس کا صحیح مفہوم کیا ہو گا، اس کی نشان دہی نہیں کی۔

17۔ سورۃ الرعد کی آیت 27 'وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ' کے ضمن میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس آیت کا مطلب سمجھنے میں شاہ عبد القادر سے غلطی ہوئی ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کفار کہتے ہیں کہ اللہ نے پیغمبر پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری کہ وہ اسے دیکھ کر اس پر ایمان لاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ جس کو گم راہ کر دیتا ہے اس کو کوئی نشانی ہدایت نہیں دے سکتی۔ کیونکہ ہدایت اور ضلالت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اسے وہ اس کو دیتا ہے جو اس کا حق دار ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنی طرف متوجہ ہونے والوں کو ہدایت دیتا ہے اور جو منہ پھیر لیتا ہے اسے گم راہ کر دیتا ہے۔"[21]

18۔ سورۃ النحل، آیت 112 'وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"اس تمثیل کو سمجھنے میں ہمارے مفسرین کو اشکال پیش آیا ہے۔ یہاں سبا کی بستی کا ذکر ان یہود کی مثال کے طور پر کیا گیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر معترض تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت میں حرام کردہ چیزوں کو جائز ٹھہرا دیا ہے۔ ان کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو انھوں نے بھی کچھ چیزوں کو جائز ٹھہرایا، لیکن یہود نے ان کی تکذیب کر دی۔"[22]

یہاں بھی امام فراہی نے تفسیر القرآن بالقرآن کا التزام کرتے ہوئے بہ طور استدلال آل عمران:

---

[20]۔ الرازی، التفسیر الکبیر 19/21-18۔

[21]۔ الفراہی، تعلیقات 1/317۔

[22]۔ ایضاً 1/358۔

50، سباء:20-15 اور سورۃ البقرہ، آیت 106 کا حوالہ دیا ہے جہاں اس کی صراحت موجود ہے۔

19۔ سورۃ الکہف، آیت 40 میں وارد 'حُسۡبَانًا' کی توضیح میں لکھتے ہیں:

"اس کے معنی چھوٹے نیزے کے بتائے گئے ہیں اور یہ 'حسبانۃ' کی جمع ہے۔ نیز کہا گیا ہے کہ 'حسبان' کے معنی اللہ کے فیصلے کے ہیں، جو وہ کرتا ہے۔ ایک معنی عذاب کے بھی بتائے گئے ہیں۔ نیز کڑک، کیڑے مکوڑے، غبار، بادِ تند اور بادلوں کے معنی میں بھی اس کو لیا گیا ہے۔ یہ تمام معانی محض اٹکل سے بیان کیے گئے ہیں۔"[23]

یہاں بھی امام فراہی کو 'حُسۡبَانًا' کے مذکورہ مفاہیم پر شرح صدر نہیں ہے اور وہ انھیں گمان محض قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کا صحیح مفہوم کیا ہو گا، اس کی نشان دہی نہیں کی ہے۔ عمر عزیز نے اگر انھیں مہلت دی ہوتی اور انھیں اس مسودہ پر نظر ثانی کا موقع میسر آیا ہوتا تو شاید وہ اس کے صحیح معنی کی نشان دہی کرنے کی ضرور کوشش کرتے۔

[باقی]

---

[23]۔ ایضاً 18385۔

مولانا امین احسن اصلاحی

نبی ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت

(2)

محبت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی چوتھی شرط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہماری محبت ہے۔ دین میں وہ ایمان یا وہ اطاعت معتبر نہیں ہے جس کی بنیاد محبت پر نہ ہو۔ ایسی اطاعت جس کی تہ میں محبت کا جذبہ کارفرما نہ ہو بعض حالات میں محض نفاق ہوتی ہے۔ پھر محبت بھی محض رسمی اور ظاہری قسم کی مطلوب نہیں ہے، بلکہ ایسی محبت مطلوب ہے جو تمام محبتوں پر غالب آجائے جس کے مقابل میں عزیز سے عزیز رشتے اور محبوب سے محبوب تعلقات کی بھی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہ جائے، جس کے لیے دنیا کی ہر چیز کو چھوڑا جا سکے لیکن خود اس کو کسی قیمت پر باقی نہ چھوڑا جا سکے۔ قرآن مجید میں اس محبت کا معیار یہ بتایا گیا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ

”کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارے خاندان اور مال جو تم نے کمایا ہے اور تجارت جس کے گر جانے کا تمھیں اندیشہ ہے اور مکانات جو تمھیں

سَبِيۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ.(التوبہ 9:24)

پسند ہیں، اگر یہ ساری چیزیں تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔“

اسی حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے احادیث میں بھی واضح فرما ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ کسی شخص کا ایمان بالرسول متحقق نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ کو اپنے باپ بیٹے اور دوسرے تمام عزیزوں اور قرابت داروں سے عزیز نہ رکھے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین.[1](متفق علیہ)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اس کے بیٹے اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔“

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کی محبت کے بعد ہی کوئی شخص ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا ہو سکتا ہے۔

ثلث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان من کان اللّٰہ ورسولہ احب الیہ مما سواء.(متفق علیہ)

”تین چیزیں جس شخص میں ہوں گی، وہ ان کے سبب سے ایمان کا مزا چکھے گا۔ ایک وہ شخص جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔“

لیکن یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس محبت کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس سے مقصود محض وہ جذباتی محبت نہیں ہے جو آدمی کو فطری طور پر اپنے

[1] ۔ مشکوٰۃ، باب الایمان۔

بیوی بچوں یا اپنے دوسرے عزیزوں کے ساتھ ہوتی ہے، بلکہ اس سے مقصود وہ عقلی اور اصولی محبت بھی ہے جو ایک شخص کو کسی اصول اور مسلک کے ساتھ ہوا کرتی ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی زندگی میں ہر جگہ اسی اصول اور اسی مسلک کو مقدم رکھتا ہے، اس اصول اور مسلک کے اوپر وہ ہر چیز اور ہر اصول، ہر مسلک اور ہر خواہش اور ہر حکم کو قربان کر دیتا ہے، لیکن خود اس کو دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہیں کرتا۔ اس اصول اور مسلک کی برتری کے لیے وہ ساری چیزوں کو پست کر دیتا ہے، لیکن اس اصول اور مسلک کو کسی حالت میں بھی پست دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ اگر اس سے خود اس کا اپنا نفس اس مسلک کی مخالفت میں مزاحم ہوتا ہے تو وہ اس سے بھی لڑتا ہے، اگر دوسرے اس سے مزاحم ہوتے ہیں تو ان کا بھی وہ مقابلہ کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے بیوی بچوں اور اعزا و اقارب کے مطالبات بھی اگر اس کے اس مسلک کے مطالبات سے کسی مرحلہ پر ٹکراتے ہیں تو وہ اپنے اس اصول اور مسلک کا ساتھ دیتا ہے اور بے تکلف اپنی بیوی بچوں کی خواہشوں اور اپنے خاندان اور قوم کے مطالبہ کو ٹھکرا دیتا ہے۔

اس محبت کا اصولی اور عقلی ہونا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں واضح فرما دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

من احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنۃ.(ترمذی)

”جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہو گا۔“

اطاعت بلا محبت اور محبت بلا اتباع

اس تفصیل سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارا ایمانی تعلق اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتا جب تک اس ایمان کی بنیاد اطاعت، اتباع اور محبت پر نہ ہو، وہیں مختلف اشارات سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اطاعت بلا محبت کے نفاق اور محبت بلا اطاعت و اتباع کے بدعت ہے۔

یہ بات کہ محبت بلا اطاعت نفاق ہے، خود قرآن مجید سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے حوالی مدینہ

کے بہت سے اعراب اسلام کی سیاسی طاقت بڑھ جانے کے بعد اسلامی احکام و قوانین کی ظاہری اطاعت کرنے لگے تھے، لیکن یہ اطاعت محض سیاسی مصالح کے تحت مجبورانہ تھی، اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اس ایمان کا نتیجہ نہیں تھی جس کی اصلی روح اخلاص و اعتماد ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے جب بعض مواقع پر اپنے ایمان کا دعویٰ اس طرح کیا جس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ انھوں نے ایمان لا کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور اسلام پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے تو قرآن نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی کہ ان مدعیان ایمان سے کہہ دو کہ محض اسلامی احکام و قوانین کی ظاہری اطاعت سے آدمی مومن نہیں ہو جایا کرتا، بلکہ ایمان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اخلاص و محبت بھی شرط ہے اور یہ چیز تمھارے اندر مفقود ہے۔ اس وجہ سے ابھی تمھارا دعوائے ایمان بھی غلط ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ.
(الحجرات 14:49)

”اور یہ اعرابی لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے ہو۔ البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت کر لی، ابھی ایمان تمھارے دلوں کے اندر نہیں داخل ہوا ہے۔“

رہی دوسری بات یعنی محبت بلا اطاعت و اتباع کا بدعت ہونا تو یہ اوپر کی آیات و احادیث سے واضح طور پر نکلتی ہے۔

جس طرح قرآن مجید نے 'ان کنتم تحبون اللہ' والی آیت میں اللہ کی محبت کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے اور بغیر اتباعِ نبی کے اللہ کی محبت کے جتنے طریقے ایجاد کیے گئے ہیں ان سب کو بدعت و ضلالت قرار دیا ہے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'من احب سنتی فقد احبنی' والی حدیث میں یہ واضح فرما دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کی سنت کے ساتھ محبت کی جائے اور بعض دوسری حدیثوں میں آپ نے اپنی محبت میں اس قسم کے غلو کی ممانعت فرمائی ہے جس قسم کا غلو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی محبت میں کیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ہدایت اور یہ ممانعت اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ جو لوگ نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن آپ کی سنت کی پیروی نہیں کرتے، اول تو ان کا دعویٰ ہی بے حقیقت ہے اور اگر اس کے اندر سچائی کی رمق ہے بھی تو ان کی یہ محبت بالکل بے معنی محبت ہے اور اگر انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرنے کے کچھ ایسے طریقے بھی ایجاد کر لیے ہیں جو صریحاً آپ کی سنت کے خلاف ہیں تو یہ اسی طرح کی بدعت ہے جس طرح کی بدعت نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کی محبت میں کی ہے کہ ان کو پیغمبر کے بجاے خدا بنا کے بٹھا دیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محض عقلی و اصولی ہی نہیں تھی، بلکہ جذباتی بھی تھی۔ لیکن یہ جذبات کبھی حدودِ کتاب و سنت سے متجاوز نہیں ہوتے تھے۔ ایک طرف یہ حال تھا کہ صحابہ اپنے اوپر بڑی سے بڑی تکلیف اٹھا لیتے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تلووں میں ایک کانٹے کا چبھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں ان کے اپنے جسم تیروں سے چھلنی ہو جاتے تھے، لیکن وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے جیتے جی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بال بھی بیکا ہو۔ مرد تو مرد عورتوں تک کے جذبات کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے بیٹے اور شوہر اور باپ اور بھائی سب کو قربان کر کے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی کی آرزوئیں رکھتی تھیں، دوسری طرف اتباعِ سنت کا یہ اہتمام تھا کہ اس محبت سے مغلوب ہو کر بھی کبھی کوئی ایسی بات ان سے صادر نہیں ہوتی تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح ہدایات تو درکنار، آپ کی پسند ہی کے خلاف ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ملاحظہ ہو:

عن انس قال لم یکن شخص احب الیھم من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وکانوا اذا رأوہ لم یقوموا لما یعلومن کراھیتہ لذلك.
(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص بھی محبوب نہ تھا۔ لیکن جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے تو آپ کی تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوتے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ آپ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں۔“

لیکن آج اگر ہم مسلمانوں کا جائزہ لیں تو ان کے اندر عظیم اکثریت ایسے ہی لوگوں کی نکلے گی جو یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اس ایمان کے ساتھ اطاعت موجود

نہیں ہے۔ یا محبت کا دم بھرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ اتباعِ سنت نہیں ہے۔ اطاعت اور اتباع، دونوں کی جگہ انھوں نے اپنے جی سے چند چیزیں ایجاد کر لی ہیں۔ کچھ میلاد کی مجلسیں منعقد کر دیتے ہیں، کچھ دیگیں پکوا کے تقسیم کر دیتے ہیں، ایک آدھ جلوس نکلوا دیتے ہیں، کچھ نعرے لگوا دیتے ہیں۔ بس اس طرح کی کچھ باتیں ہیں جن سے ان کا ایمان اور ان کی محبتِ رسول عبارت ہے۔ آپ کو کتنے ایسے اشخاص مل جائیں گے جنھوں نے نماز مدت العمر نہیں پڑھی، لیکن مہینا میں میلاد کی مجلسیں اور قوالی کی محفلیں کئی بار منعقد کرتے ہیں۔ مال رکھتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرنے کی ان کو کبھی توفیق نہیں ہوئی، لیکن اپنی بدعات پر جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر کرتے ہیں، ہر سال ہزار ہا روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ ان کو اس بات کی کبھی توفیق نہیں ہوتی کہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا مطالبہ کریں اور ان کی روشنی میں اپنی زندگیوں کا جائزہ لے کر ان کو درست کرنے کوشش کریں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں اپنے آپ کو ہر وقت سرشار ظاہر کرتے ہیں اور نعتیہ اشعار پڑھ کر یا سن کر ان پر وارفتگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

یہ حالت ہمارے کسی ایک ہی طبقہ کی نہیں ہے، بلکہ ہمارے اکثر طبقے اسی قسم کی محبت رسول کے دعوے دار ہیں اور اگر کچھ لوگ اتباع سنت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں تو ان کا حال بھی یہ ہے کہ ان کے نزدیک تمام سنت جن چند اخلاقی مسائل کے اندر سمٹ آئی ہے بس انھی چند چیزوں پر ان کا سارا زور صرف ہوتا ہے گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف انھی چند مسائل کی تعلیم کے لیے ہوئی تھی۔

سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

(2)

اگلے سال 1941ء میں غالباً جماعت کی خواہش پر جو لکھنؤ میں قائم ہو چکی تھی اور جس کا میں ذمہ دار تھا، وہ دوبارہ تشریف لائے۔ آنے سے پہلے حسب معمول انھوں نے مجھے خط لکھا۔ میں نے غالباً ان سے لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے ایک مقالہ تیار کرنے کی فرمایش کی تھی۔ ان کا یہ خط جو 29 ستمبر 1941 کا لکھا ہوا ہے، اس کے جواب میں ہے۔

"مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور۔ 29 ستمبر 1941

محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم

آپ کے پہلے عنایت نامہ کا جواب پہلے دے چکا ہوں، بعد میں کارڈ ملا، خطبہ کے لیے "نیا نظام عالم" کوئی نیا موضوع نہیں، نہایت پامال چیز ہے، اور آج کل کچھ فیشن ہو گیا ہے کہ ہر ایک اس پر کچھ نہ کچھ بولے۔ اس بنا پر نہ میرے خطبہ کی کوئی خصوصیت ہو گی اور نہ اس کی طرف کوئی توجہ کرے گا، اس کے بجاے خطبہ کا یہ عنوان بہتر ہے "نوع انسانی کا معاشی (یا اقتصادی) مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" آپ یونیورسٹی کے سیکریٹری صاحب کو اطلاع دے دیجئے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ"

مولانا لکھنؤ تشریف لائے اور نوجوانوں نے پروانہ وار ہجوم کیا۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی

یونین میں عنوان بالا کے تحت اپنا فاضلانہ خطبہ پڑھا، جو ان کے مضامین میں شائع ہو گیا ہے، اسی کے ساتھ وہ دار العلوم ندوۃ العلما کے لیے ایک مقالہ ''نیا تعلیمی نظام'' کے عنوان سے میری فرمایش پر لکھ کر لائے تھے، جو طلبا کی انجمن ''الاصلاح'' میں پڑھا گیا۔ میرا رابطہ مولانا سے اور جماعت سے برابر قائم رہا۔ میں نے جماعت کی اس مجلس عاملہ کے جلسہ میں شرکت کی جو فروری 1942 کو لاہور میں منعقد ہوا تھا اور جس میں مولانا کی تحریروں اور بعض خیالات کی اس مخالفت کی بنا پر جو ہندوستان کے بعض مشاہیر فضلا اور اہل قلم نے شروع کر رکھی تھی، یہ مسئلہ در پیش تھا کہ مولانا فی الحال جماعت کی امارت سے سبکدوشی اختیار کر لیں، اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کو امیر منتخب کیا جائے۔ جماعت کی زندگی اور تاریخ میں یہ مرحلہ بہت اہم تھا، میرا ووٹ اس میں مولانا کے حق میں تھا اور اس کی بنیاد یہ تھی کہ یہ ایک مصنوعی رد وبدل ہو گا، جس سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہ ہو گا۔ جماعت کا وجود مولانا کی تحریروں کے اثر سے عمل میں آیا ہے اور اس کی وابستگی اور انتساب بدستور انھیں کی طرف رہے گا۔ اسی پر فیصلہ ہوا اور جماعت کا نظام وہی رہا۔ جماعت کی دوسری مجلس انتظامیہ میں میری شرکت اکتوبر 1942 میں دہلی میں ہوئی، اس موقع پر میں مولانا کے ساتھ علی گڑھ بھی گیا اور ایک دو دن اولڈ بوائز لاج میں ہم دونوں کا قیام رہا۔ میں نے یونیورسٹی کے حلقہ میں مولانا کی مقبولیت کا اندازہ کیا۔

اس زمانہ میں مولانا کو عربی میں ایک ایسے رسالہ کے اجرا کا بڑا تقاضا تھا، جو دعوت و جماعت کا ترجمان بن سکے۔ میں نے اس سلسلہ کی مشکلات کا ذکر کیا اور اس پر اتفاق ہوا کہ فی الحال عربی میں مضامین کے ترجمے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے اور ان کو عالم عربی کے موقر مجلات و رسائل میں بھیجا جائے۔ مولانا یہ خدمت میرے سپرد کرنا چاہتے تھے، میں نے اس کے لیے رفیق محترم مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کا نام تجویز کیا جو مولانا نے منظور کیا، اور اس کے نتیجہ میں پہلے مشرقی پنجاب جالندھر میں پھر مغربی پنجاب گجراں والہ میں ''دار العروبہ'' کے نام سے ادارہ قائم ہوا، اور مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم نے اس سلسلہ کو اس قابلیت و خوبی سے انجام دیا کہ عالم عربی میں مولانا کا اور ان کی دعوت و تحریک کا ایسا تعارف ہوا کہ اگر مولانا کا خود بھی عربی میں لکھنے کا معمول اور تجربہ ہوتا تو اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔ عالم عربی میں مولانا کی مقبولیت اور تعارف کا یہ کتابیں سنگ بنیاد ثابت ہوئیں اور انھوں نے اس کے لیے راہ ہموار کر دی، جس سے بعد میں پورا فائدہ

اٹھایا گیا۔ جماعت و تحریک کی تاریخ میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مارچ 1944 میں صوبہ سرحد و پنجاب کے ایک سفر کے دوران میں مجھے دار الاسلام پٹھان کوٹ (جہاں مولانا مستقل طور سے مقیم تھے اور جس کو تحریک کا مرکز بنانا تجویز ہوا تھا) جانے کا اتفاق ہوا اور کچھ دن ان کا مہمان بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد عرصہ تک ذاتی ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ 1954ء میں جب تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان جانا ہوا تو لاہور کے قیام کے دوران میں مولانا سے لاہور سینٹرل جیل میں ملاقات ہوئی، اس ملاقات میں ملک نصر اللہ خاں عزیز میرے رفیق و رہبر تھے، مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم کا قریبی زمانہ میں انتقال ہوا تھا، ہم دونوں نے ایک دوسرے سے تعزیت کی۔

اس کے بعد جون 1956 میں ان سے ملنا ہوا جب وہ ہمارے دوست ڈاکٹر سعید رمضان کی دعوت پر ان کی منعقد کی ہوئی مؤتمر اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے دمشق آئے۔ میں ایک دو مہینا پہلے سے دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر وہاں گیا ہوا تھا، اس موقع پر پاکستان سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم اور مولانا ظفر احمد صاحب انصاری بھی آئے ہوئے تھے۔ کانفرنس میں ڈاکٹر محمد ناصر سابق وزیر اعظم انڈونیشیا کو صدر اور مولانا کو اور مجھے نائب صدر منتخب کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کا سلسلہ کئی روز جاری رہا اور دو مرتبہ مجھے مولانا کی خواہش اور اصرار پر ان کی تقریر کا عربی میں ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے بعد 1962ء میں جب مدینہ طیبہ میں جامعۂ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا اور ہم دونوں اس کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے تو مسلسل کئی روز ملنے اور اس کمیٹی میں شرکت کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی سال حج کے موقع پر رابطۂ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور ہم دونوں اس کی مجلس تاسیسی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس سلسلہ سے کئی مرتبہ اس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر مولانا سے ملنے اور رابطہ کے جلسوں میں قریب بیٹھنے کا موقع ملا، یہاں تک کہ گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے مولانا کے سفر کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ غالباً آخری اجلاس جس میں ہم دونوں نے شرکت کی 1967ء کا اجلاس تھا۔

آخری ملاقات جولائی 1978 کی کسی تاریخ کو لاہور میں مولانا کے دولت خانہ پر ہوئی۔ مولانا بڑے اخلاق اور تپاک سے ملے، پاکستان کے موجودہ حالات پر تبصرہ ہوا۔ میں کراچی میں رابطہ کی

طرف سے ہونے والی پہلی اسلامی ایشیائی کانفرنس میں شرکت اور پاکستان کا ایک مختصر دورہ کر کے لاہور پہنچا تھا۔ ہم دونوں اس پر متفق تھے کہ موجودہ انقلاب ایک خوش آئند اور مبارک انقلاب ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ بات واضح ہے کہ اس کے دین پسند سربراہوں اور قائدین کی مدد کرنی چاہیے اور ان کو ناکام نہیں ہونے دینا چاہیے۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

1943ء میں میرا ضابطہ سے جماعت سے تعلق نہیں رہا تھا، لیکن مولانا سے اور پیشتر رفقاے جماعت سے دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات تھے، اور ایک دوسرے کے احترام اور اعتراف میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مارچ 1944 میں جب میں دار الاسلام میں ان کا مہمان ہوا تو وہ میری اس ذہنی تبدیلی اور جماعت کی فکر سے میری بے اطمینانی سے واقف ہو چکے تھے، لیکن اس کا تعلقات اور باہمی ربط و ضبط پر کوئی اثر نہ تھا۔ عربی دعوتی لٹریچر کے بارے میں تبادلۂ خیال بھی ہوا اور مولانا نے میرا ایک عربی مضمون جو ''دعوتان متنافستان'' (دو حریف اور مد مقابل دعوتیں) کے عنوان سے تھا،[1] ملاحظہ فرمایا اور پسند کیا۔ وہ مع تمام رفقا کے اسٹیشن مجھے رخصت کرنے کے لیے تشریف لائے۔

میرے مولانا کی تحریروں اور جماعت کے لٹریچر سے تاثر اور وابستگی کی بنیاد مولانا کے وہ فاضلانہ تنقیدی مضامین تھے، جو انھوں نے مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات اور موجودہ مادی نقطۂ نظر کے خلاف لکھے تھے، اور جن کا بڑا حصہ ان کے مجموعۂ مضامین ''تنقیحات'' میں شامل ہے۔ یہاں میرے اور مولانا کے خیال میں وہی توارد تھا، جو ایک چھوٹے اور بڑے نو مشق و کہنہ مشق مصنفوں کے درمیان ہو سکتا ہے۔ دین کی اس جدید تفہیم و تشریح سے نہ مجھے کچھ زیادہ دل چسپی تھی نہ ضرورت، جو مولانا کی دوسری کتابوں مثلاً ''قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں''، ''تفہیمات'' اور ''رسائل و مسائل'' میں پائی جاتی ہے، اس لیے کہ اس بارے میں میرا معاملہ کسی ایسے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان سے بالکل مختلف تھا، جو دین کا تصور اور اس کا فہم اس کے اصل سرچشموں (کتاب و سنت اور دینی ماحول و تربیت) کے بجاے کلیۃً مولانا یا کسی دوسرے مسلمان

---

[1]۔ مشمولہ مجموعۂ مضامین (الی الاسلام من جدید) اس سے مراد اسلام اور مغربی تہذیب اور مادی فلسفۂ حیات ہے۔

مفکر و مصنف کی کتابوں سے حاصل کرتا ہے۔ میں اپنے براہ راست دینی مطالعہ اور ان متقدمین اور بعض متاخرین کی کتابوں سے استفادہ کرنے کی بنا پر جو کتاب و سنت کا وسیع و عمیق علم رکھتے تھے، اور ان کے یہاں مجتہدانہ فکر و نظر اور نمایاں گہرائی ملتی ہے، مولانا کو ایسا یگانۂ روزگار مفکر اسلام سمجھنے سے قاصر تھا، جس کی نظیر صدیوں میں نہیں ملتی۔ میں ان کا اصل امتیاز و جوہر ذہانت، ذہن کی صفائی و رسائی اور نئے انداز میں تحریر و تفہیم کی امتیازی قوت و قدرت سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ جماعت کے اس علمی اور تنقیدی حصہ کو جو مغربی تہذیب اور موجودہ مادی فلسفوں اور نظام ہائے حیات سے متعلق تھا، دین کی اس تفہیم و تشریح سے الگ نہیں کیا جاسکتا جو خود مولانا اور جماعت کے قائدین کی نظر میں بنیاد اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرا شعور جس قدر پختہ اور میرا مطالعہ اور تجربہ جتنا وسیع ہوتا گیا، میری ذہنی کشمکش میں اضافہ ہوتا گیا، اس کا نقطۂ ارتقاوہ تھا، جب میری ہندوستان کے مشہور تبلیغی تحریک کے داعی و بانی مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں آمد و رفت زیادہ ہوئی۔ میں جب ان کی زندگی، ان کی باطنی کیفیات اور ان کی ایمان واحتساب کی دعوت سے گہرے طور سے متاثر ہوا تو یہ ذہنی خلیج عمیق اور وسیع ہونے لگی اور مجھے احساس ہوا کہ دعوتِ نبوت اور اس کے حامل کا مزاج اور اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں، اور وہ ایک ایسی تحریک و دعوت سے کتنی مختلف ہوتی ہیں، جس کی بنیاد خالص مطالعہ، ذہانت اور کسی فلسفہ و نظام کے رد عمل پر ہوتی ہے... میں نے ایک بار لکھنؤ سے جب مولانا مودودی کو اپنی اس ذہنی کشمکش کا حال لکھا اور ان کو مولانا محمد الیاس صاحب سے میرے گہرے تاثر اور تبلیغی کام میں روز افزوں انہماک کا حال بطور خود بھی معلوم ہوا تو انھوں نے مجھے اس بارے میں یکسو ہو جانے کی اجازت، بلکہ مشورہ دیا۔

میں نے جماعت سے اپنی بے اطمینانی اور اس کے اسباب کا اظہار کرنے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیا اور جماعت کے موافقین یا مخالفین نے جب خط و کتابت کے ذریعے سے مجھ سے میری علیحدگی کے اسباب اور مولانا یا جماعت کے بارے میں میری رائے دریافت کی تو میں نے اس کا ایسا جواب دینے سے ہمیشہ احتراز کیا جس کو اشاعت میں لاکر غلط مقاصد حاصل کیے جاسکتے تھے۔ بے اطمینانی کے اسباب ریاضی و اقلیدس کے قواعد کی طرح چند بندھے ٹکے لفظوں اور ضابطوں کی شکل میں بیان نہیں کیے جاسکتے۔ اس کے اسباب مختلف النوع ہو سکتے ہیں، ان کا تعلق تعلیم و

تربیت، ماحول کے اختلاف، وہ شخصیتیں جن سے آدمی متاثر ہوتا ہے، ان کی رنگارنگی، ذاتی تجربات، موروثی و خاندانی اثرات، ذہنی ارتقا اور مطالعہ کے نتائج سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور ان سب کا الفاظ کی گرفت میں (خاص طور سے مختصر خطوط کی شکل میں) آنا مشکل ہوتا ہے۔ میں عام طور پر اس کے جواب میں لکھ دیتا تھا کہ اس کے سمجھنے کے لیے آپ میری کتاب ''ارکان اربعہ''، ''منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین''، ''تاریخ دعوت و عزیمت'' اور عربی ''ربانیة لا رهبانية''[2] کا مطالعہ کیجئے۔

یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا، جب تک کہ میں دیانت کے ساتھ اس نتیجہ پر نہیں پہنچ گیا کہ اب مجھے مولانا کے دین کی اس تفہیم و تشریح کے متعلق کچھ لکھنا چاہیے جس کی بنیاد ان کی کتاب ''قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں'' ہے، اور جو اقلیدس کے اصول موضوعہ کی طرح ان کی فکر و دعوت میں جاری و ساری ہے۔ اور میں نے اس تفہیم و تشریح کا اثر برصغیر اور ممالک عربیہ کے ان نوجوانوں کی فکر و تحریر میں نمایاں طریقہ پر دیکھا، جنھوں نے دین کو مولانا اور ان کے نامور عرب خوشہ چیں اور میرے عزیز و محبوب دوست سید قطب شہید کی دینی ترجمانی اور تفہیم سے اخذ کیا تھا اور انھوں نے دینی حقائق و مقاصد کو انھی کے ذریعے سے سمجھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ فکر و عمل اور سعی و جہد کی پٹڑی بدلتی جا رہی ہے اور اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ وہ ایک خالص مادی سیاسی و تنظیمی تحریک کی شکل نہ اختیار کرے جو کسی نیک اور بلند مقصد کے لیے وجود میں آسکتی ہے۔ میں نے سب سے پہلے اپنی عربی کتاب ''النبوة والانبياء في ضوء القرآن'' کے تیسرے اور اس کے اردو ترجمہ ''منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین'' کے دوسرے ایڈیشن میں اس پر مختصراً ایک نوٹ لکھا۔ پھر بڑے فکر و تامل اور دعا و استخارہ کے بعد ایک دینی فریضہ سمجھتے ہوئے رمضان 1398ھ اگست 1977 میں اس موضوع پر مستقلاً قلم اٹھایا، اور ایک شاہد عینی اور مستفید کی حیثیت سے اس کو ضروری سمجھا کہ مولانا کی خدمات اور ان کی تصنیفی انفرادیت کا پورا پورا اعتراف کرتے ہوئے اپنے خدشات اور اندیشوں کو ظاہر کیا جائے کہ جماعت میں شریک

---

[2]۔ اب اس کا اردو ترجمہ ''تزکیہ واحسان یا تصوف و سلوک'' کے نام سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد بلاشبہ دین کی طالب اور خدمت دین اور اعلاء کلمتہ اللہ کی حریص و خواہش مند ہے، اور اس کو جب کتاب و سنت کی روشنی میں مخلصانہ مشورہ دیا جائے گا، تو اس سے وہ ضرور فائدہ اٹھائے گی، اس لیے کہ اس کے دستور نے یہ کہہ کر کہ "رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے اور کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو"۔ نیز مولانا کے لٹریچر نے جو اسی اصول پر مبنی ہے، اس کے ذہن کی وہ تربیت کی ہے، جو عصر حاضر میں کم جماعتوں کی گئی ہوگی۔ میں نے کتاب کے مسودہ کو بار بار اس خیال سے پڑھا کہ اس میں کوئی طنز یہ جملہ یا تیز لفظ ایسا نہ ہو جو اس مقصد کے لیے مضر ہو اور جہاں کوئی جملہ یا لفظ زور قلم میں اتفاقاً نکل گیا تھا اس کو حذف کر دیا۔

میرا ارادہ تھا کہ کتاب کے چھپنے کے بعد اس کا پہلا نسخہ اپنے خط کے ساتھ مولانا کی خدمت میں بھیجوں۔ میں نے یہ خط احمد نگر سے 30 اکتوبر 1978 کو لکھا، لیکن جن صاحب کے ساتھ اس کتاب اور خط کو بھیجنا تھا، ان کا سفر ملتوی ہو گیا اور کتاب قدرے تاخیر سے ان کو ملی۔ اس کتاب پر مولانا کا رد عمل اس رد عمل سے بہت مختلف تھا جو ہندوستان میں جماعت کے حلقہ کے عام ہم دردوں اور متفقین میں دیکھا گیا۔ میری کتاب غالباً مولانا کو وسط جنوری 1979 میں ملی، انھوں نے 23 جنوری کو اس کی رسید دیتے ہوئے حسب ذیل گرامی نامہ تحریر کیا۔

"اے، ذیل دار پارک اچھرہ، لاہور پاکستان

محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ مورخہ 5 / صفر 99ھ ملا، اور اس کے ساتھ آپ کی تازہ کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کا ایک نسخہ بھی موصول ہوا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ میری جس چیز کو آپ نے خدشات کا موجب سمجھا اس پر تنقید فرمائی، مزید میری جن چیزوں کو آپ دین اور اہل دین کے لیے مضرت رساں یا موجب خطر رکھتے ہوں ان پر بھی آپ بلا تکلف تنقید فرمائیں، میں نے کبھی اپنے کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا، نہ میں اس پر برا مانتا ہوں۔ البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ میں ہر تنقید کو برحق مان لوں اور ناقدین کے بیان کردہ خدشات اور اندیشوں کو صحیح تسلیم کر لوں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ"

اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں، میں اظہار خیال، دینی صلاح و مشورہ اور فکر و فہم کے اس قدرتی تنوع کے حق کو محفوظ رکھتے ہوئے (جو ہر صاحب فکر، بلکہ طالب علم کا حق ہے اور جس کا اظہار تاریخ اسلام کے ہر دور میں ہوتا رہا ہے) بحیثیت مصنف، متکلم، مفکر اور داعی کے ان کی امتیازی و انفرادی خصوصیات اور بڑائی کا نہ صرف فراخ دلی، بلکہ مسرت اور بہت سے مشترک روابط و خصوصیات کی بنا پر ایک گونہ فخر کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی ان کو ان کی اسلامی خدمات کا پورا صلہ عطا فرمائے، ان کی ان لغزشوں سے جن سے نبی معصوم کے سوا کوئی فرد بشر خالی نہیں، درگزر فرمائے، اور امت مسلمہ کی صحیح رہنمائی اور دست گیری فرمائے۔

اللھم اغفر لہ ولا تفتنا بعدہ

علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی

وفات سلیمان علیہ السلام*

جنات پر حضرت سلیمان کا زندگی بھر تسلط رہا۔ متعدد سرکش شیاطین کو آپ نے زنجیروں میں جکڑوا کر قید بھی کر دیا تھا جیسا کہ سورۂ ص میں ہے 'وَّاٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ' آخر وقت تک کوئی بڑے سے بڑا عفریت بھی آپ کے خلاف دم نہ مار سکا۔ مگر جب آپ کی وفات ہو گئی تو قیدی شیاطین کو قید سے اور مشغول خدمات جنات کو خدمت و چاکری سے نجات مل گئی۔ انھیں آپ کی وفات کا بر وقت پتا نہ لگ سکا تھا کیونکہ وہ اطراف مملکت میں قلعوں اور بلند و بالا عمارتوں کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے۔ مگر جب انھیں مملکت میں پھیلی ہوئی بد نظمی کا احساس ہوا جو حضرت سلیمان کے ناخلف جانشین "رجعام" کے تخت نشین ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، جیسے ہندوستان میں بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ کی وسیع و مستحکم سلطنت اس کے ناخلف جانشین 'معظم شاہ' کی وجہ سے کم زور و پارہ پارہ اور بد نظمیوں کا شکار ہوئی اور جیسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وسیع سلطنت ان کے فرزند یزید سے نہ سنبھل سکی، تو جنات نے اس بد نظمی کا سبب معلوم کیا تو پتا چلا کہ حضرت سلیمان وفات پا گئے ہیں اور ان کا بیٹا رجعام ان کی جگہ تخت نشین ہو گیا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ متعلقہ خدمات سے دست بردار ہو گئے اور اپنے ہم قوم قیدیوں کو بھی قید و بند سے نکال لے گئے۔ انھیں رہ رہ کر افسوس ہوتا تھا کہ سلیمان کے مر جانے کا ہمیں بر وقت علم ہو جاتا تو اتنے دنوں تک یہ تکلیفیں ہم نہ اٹھاتے۔ ناخلفی و ضرر رسانی میں حضرت سلیمان کا بیٹا رجعام

* ماخوذ از تفسیر سورۂ فاطر، مفتاح القرآن، چوتھی جلد زیر ترتیب۔

دیمک یا گھن کی طرح تھا جو حضرت سلیمان کی لاٹھی یعنی اقتدار کو کھا کر خاک میں ملا رہا تھا۔ نتیجہ یہی ہوا کہ سلیمانی اقتدار کا وہ فلک بوس محل دھڑام سے زمین پر آ گرا۔ ایک مملکت دو حریف مملکتوں میں بدل گئی یہودیہ اور اسرائیل۔ اور توحید کو چھوڑ کر دونوں مملکتوں کے یہودی باشندے شرک اور فسق و فجور کی دلدل میں گرتے چلے گئے۔ بالآخر اولاً اسرائیل پھر یہودیہ دونوں ریاستیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔

الغرض مشغول خدمت جنات کو حضرت سلیمان کی وفات کا پتا اس زمین کے کیڑے رجعام سے لگا تھا جو اپنے باپ کے بے نظیر اقتدار کو گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ .(السباء14:34)

”پس جب ہم نے اس پر موت کا فیصلہ نافذ کر دیا تو انھیں یعنی جنات کو اس کی موت کا سراغ زمین کے کیڑے نے ہی دیا جو اس کی لاٹھی کو کھا رہا تھا۔ پس جب وہ گر گیا تو جن متفرق ہو گئے۔ اس لیے کہ اگر وہ آنکھوں سے اوجھل بات جانتے ہوتے تو ذلیل کر دینے والے دکھ میں نہ رہتے۔“

(تنبیہ) میں سمجھتا ہوں کہ اس ارشاد میں بطور استعارہ 'دابۃ الارض' سے مراد حضرت سلیمان کا نالائق بیٹا رجعام ہے جو ان کی وفات کے بعد سلطنت کا وارث ہوا تھا۔ بطور استعارہ جیسے بہادر مرد کو اسد (شیر) کہہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک پست حوصلہ و ضرر رساں شخص کو 'دابۃ الارض' کہا گیا ہے اور عصا یا 'مِنْسأۃ' (لاٹھی) کا اقتدار کے معنی میں استعارہ معروف ہے۔ اور 'تَبَيَّنَتْ' بمعنی 'تَفَرَّقَتْ' ہے۔ اس کا ماخذ 'بَيْن' بمعنی جدائی ہے اور 'الغَيْب' سے مراد حضرت سلیمان کی وفات کا علم ہے جو جنات کو بروقت حاصل نہ ہوا تھا، اس لیے کہ وہ دارالسلطنت یعنی یروشلم سے دور دراز مقامات پر تعمیری خدمات میں مشغول تھے۔

بے شک میری ذکر کردہ یہ تفسیر دیگر مفسرین سے مختلف ہے، لیکن تقابل سے ثابت ہو گا کہ اس آیت کی صحیح تفسیر یہی ہے جو میں نے تحریر کی ہے۔ والحمد للّٰہ علی ذلك

یہاں میں مثال کے طور پر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان نقل کر کے زیر نقد لانا چاہتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔ موصوف نے لکھا ہے:

"حضرت سلیمان جنوں کے ہاتھ سے مسجد بیت المقدس کی تجدید کرا رہے تھے۔ جب معلوم کیا کہ میری موت آ پہنچی، جنوں کو نقشہ بتا کر آپ ایک شیشہ کے مکان میں در بند کر کے عبادت الٰہی میں مشغول ہو گئے، جیسا کہ آپ کی عادت تھی کہ مہینوں خلوت میں رہ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ اسی حالت میں فرشتہ نے روح قبض کر لی اور آپ کی نعش مبارک لکڑی کے سہارے کھڑی رہی۔ کسی کو آپ کی وفات کا احساس نہ ہو سکا۔ وفات کے بعد مدت تک جن بدستور تعمیر کرتے رہے۔ جب تعمیر پوری ہو گئی تو جس عصا پر ٹیک لگائے ہوئے تھے، وہ گھن کے کھانے سے گرا۔ تب سب کو وفات کا حال معلوم ہوا۔ اس سے جنات پر خود اپنی غیب دانی کی حقیقت کھل گئی اور ان کے معتقد انسانوں کو بھی پتا لگ گیا کہ اگر انھیں غیب کی خبر رہتی تو کیا اس ذلت آمیز تکلیف میں پڑے رہتے۔ حضرت سلیمان کی وفات کو محسوس کرتے ہی کام چھوڑ دیتے۔" (انتھی)

لیکن باور کرنا چاہیے کہ یہ تابعین یا اتباع تابعین کے دور کے کسی افسانہ ساز شخص کی گھڑی ہوئی کہانی ہے جو بدونِ تحقیق نقل ہوتی آ رہی ہے۔ اس کہانی کے غلط ہونے کے دلائل یہ ہیں:

(الف) سابق انبیاے کرام کے حالات جان سکنے کے دو ہی ذریعے ہیں: اول یہ کہ وہ قرآن مجید یا صحیح حدیث میں مذکور ہوں۔ دوم یہ کہ اسرائیلی صحیفوں میں ان کا ذکر ہو۔ پہلا ذریعہ یقینی ہے اور دوسرا ظنی۔ اور جو کہانی کسی نبی کے متعلق حضرت عیسٰی علیہ السلام سے پہلے گزری ہوئی کسی مشہور اسرائیلی شخصیت کے بارے میں نہ قرآن و حدیث میں موجود ہو نہ اسرائیلی صحیفوں میں مذکور ہو یقیناً وہ غلط ہے اور یہ قصہ ایسا ہی ہے کہ نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں، نہ بائیبل میں۔

(ب) حضرت سلیمان علیہ السلام کسی جنگل میں سب سے الگ تھلگ رہنے والے تارک الدنیا درویش نہ تھے کہ آپ کی بیماری و وفات کا حال مدت تک مخفی رہ جاتا۔ آپ کے محل میں بیویاں تھیں، کنیزیں تھیں، خدام تھے۔ ناممکن ہے کہ وہ سب آپ سے ایسے غیر متعلق رہتے ہوں کہ وفات کے بعد بھی طویل مدت تک ان میں سے کسی کو آپ کی وفات کا پتا نہ چلے۔

(ج) یہ کہنا کہ آپ کی عادت تھی کہ مہینوں خلوت میں رہ کر عبادت کیا کرتے تھے، محتاج

ثبوت ہے۔ کیا یہ بات قرآن میں مذکور ہے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ہے؟ قطعاً نہیں، تو کیا بائیبل میں یا اور کسی اسرائیلی صحیفہ میں اس کا ذکر ہے؟ قطعاً نہیں، لا محالہ یہ بے ثبوت بات ہے۔ اور عقل سلیم اسے باور نہیں کر سکتی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام مہینوں اس طرح خلوت گزیں ہو جاتے ہوں کہ ان دنوں میں نہ کوئی شخص آپ سے ملتا تھا نہ آپ کسی دنیوی چیز سے تعلق رکھتے تھے، نہ کھانا نہ پینا، نہ بول و براز، نہ سونا نہ لیٹنا بس لگاتار ہر وقت مصروف عبادت رہنا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم الشان سلطنت کا فرماں روا بنایا تھا۔ عدل کے ساتھ دارِ حکومت دینا اور رعیت کی خبر گیری کرنا آپ کا فرض منصبی تھا، محال تھا کہ آپ مہینوں اس فریضہ سے غافل رہیں اور خود کو "نیکی برباد گناہ لازم" کا مصداق بنائیں۔ اطراف مملکت سے زائرین اور دیگر ممالک سے وفود برابر آپ کی خدمت میں آتے رہتے تھے۔ مہینوں ان سے صرف نظر کرنا تصور میں بھی نہیں آسکتا۔

(د) یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص لاٹھی کا سہارا لیے ہوئے کھڑا ہو اور اسی حالت میں اسے موت آجائے اور مر جانے کے بعد اس کا جسم اسی طرح لاٹھی کے سہارے کھڑا رہے۔ کیونکہ جانکنی کے وقت تھوڑی یا بہت جسم میں حرکت ضرور ہوتی ہے اور خفیف سی حرکت بھی توازن ختم کر ڈالے گی لا محالہ وہ جسم گر جائے گا۔

(ہ) حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں بھی جن جن ہی تھے یعنی عام انسانوں کی نگاہوں سے مستور و پوشیدہ۔ یہ سمجھنا کہ آپ کے زمانہ میں جن وانس کے درمیان میل جول تھا قطعاً بے تکی بات ہے۔

(و) یہود اگرچہ حضرت سلیمان کو انبیاے کرام کی فہرت میں شامل نہیں کرتے، لیکن انھیں زبردست حکمران اور نہایت خرد مند و حکیم و عالی جاہ بادشاہ تو مانتے ہیں۔ ان کی عظمت شان پر دلالت کرنے والی بہت سی باتیں اور ان کو پیش آنے والے احوال و کوائف یہود نے صحیفوں میں لکھے ہیں۔ اگر حضرت سلیمان کی وفات اس طرح شیشے سے بنے ہوئے مکان میں ہوئی ہوتی اور مدت تک ان کی لاش لاٹھی کے سہارے اس میں کھڑی رہتی اور ایک عرصۂ دراز تک ان کی وفات کا کسی کو علم نہ ہوا ہوتا تو یہ بڑا اہم اور عجیب واقعہ ہوتا۔ لا محالہ یہود اسے اور بھی نمک مرچ لگا کر اور بڑھا چڑھا کر لکھتے۔ لیکن اسرائیلی صحیفوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں تو یہ اس حقیقت کی

قطعی دلیل ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہوا ہی نہیں۔ بس بعض افسانہ ساز لوگوں نے اسے گھڑ کر مسلمانوں میں پھیلانے کا جرم کیا ہے۔

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(6)

[صاحب تدبر قرآن کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

مولانا امین احسن اصلاحی 1925ء میں دوبارہ مدرسۃ الاصلاح سے وابستہ ہوگئے۔ اب وہ مدرسے کے طلبہ کے استاذ تھے اور اپنے جید استاذ امام حمید الدین فراہی کے شاگرد خاص۔ وہ اپنی مادر علمی سے 1944ء تک وابستہ رہے۔ اس وابستگی کو ہم دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

اول: امام فراہی کی زندگی تک کا دور، جو 11 نومبر 1930ء تک ہے۔ اس دن ان کے استاذ کا سانحۂ ارتحال ہوا تھا۔

دوم: 1944ء تک، مدرسہ سے وابستگی کا دور۔ دائرۂ حمیدیہ کے تحت ماہنامہ الاصلاح کا اجرا اور امام فراہی کی تصانیف کا اردو ترجمہ۔ اس دوران میں وہ اس جریدے کے ایڈیٹر بھی رہے اور صدر مدرسہ بھی۔

امام فراہی سے براہِ راست تلمذ

مولانا امین احسن نے ہمیں بتایا کہ اصل میں امام فراہی کا پروگرام یہ تھا کہ وہ اپنے گاؤں

پھر یہہ میں مجھے بطور خاص قرآن کی تدریس کریں گے۔ اور اس مقصد کے لیے انھوں نے مجھے اپنی رہایش گاہ پر قیام کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس رہایش گاہ کے بارے میں ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی بیان کرتے ہیں کہ امین احسن کو اُس شان دار بنگلے میں قیام کے لیے کہا گیا تھا جو امام فراہی نے اپنے رہایش گاہ کے قریب بطور خاص تحقیق و مطالعے کے لیے بنوایا تھا۔ اس بنگلے کا نقشہ انھوں نے خود بنایا تھا۔

جب اس کی خبر مدرسہ میں دوسرے اساتذہ اور سینئر شاگردوں تک پہنچی تو انھیں شدید احساس محرومی ہوا۔ وہ ایک وفد بن کر امام فراہی کے پاس آئے۔ اس وفد میں استاذ مولوی سعید احمد اور استاذ اختر احسن اصلاحی بھی شامل تھے۔ پہلے تو امام فراہی نے آمادگی ظاہر نہ کی، مگر جب ان کا اصرار بڑھا تو وہ رضامند ہو گئے۔ متعدد واقعات میں سے یہ واقعہ بھی امام فراہی کی امین احسن کے بارے میں شان دار توقعات کا مظہر ہے۔

اس طرح مدرسے میں یہ خصوصی درس شروع ہو گیا، لیکن امین احسن کو ان کے استاد نے ایک خصوصی مہم پر 'ملایا' (موجودہ ملائیشیا) میں بھیج دیا۔ یہ مدرسے کے لیے مالی وسائل اکٹھا کرنے کے لیے ایک سفر تھا۔ امین احسن کو اس سفر کے لیے بطور خاص منتخب کیا گیا۔ اس سے پہلے بھی جب وہ ''مدینہ'' اخبار میں کام کرتے تھے تو اس وقت امام فراہی نے انھیں اپنے ساتھ 'برما' لے جانے کے لیے بطور خاص بلایا۔ اس کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ کیسے خواہش کے باوجود امین احسن استاذ کے ساتھ نہ جا سکے۔ اب جب دوبارہ اسی قسم کے دورے کی ضرورت پڑی تو امام فراہی کو ان سے زیادہ قابل اعتماد شاگرد نہ ملا اور انھوں نے امین احسن ہی کو اس سفر کا 'امین' بنانا زیادہ مناسب خیال کیا۔ اس انتخاب کی متعدد وجوہات میں یہ بات یقیناً ہو سکتی ہے کہ وہ بہت اچھی تقریر کر سکتے تھے اور ابلاغ کا بھی خصوصی ملکہ رکھتے تھے۔ گویا:

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملے جس کو سبق یاد رہے

اس وفد میں امین احسن کے ساتھ ان کے دوسرے استاد شبلی متکلم اور عبدالاحد صاحب اصلاحی بھی تھے۔ یہ دورہ چھے ماہ تک طویل ہوا۔ گمان غالب ہے کہ اصلاً یہ دورہ اس قدر طویل نہیں تھا۔ جب یہ زیادہ طویل ہوا تو امین احسن کے دوست اور رفیق کار اختر احسن نے انھیں خط

لکھا اور اس میں خیریت دریافت کی۔ اس کے جواب میں امین احسن نے لکھا:

''سمندر کی سرجوشی کے ایام بہار ہیں، آج کل سفر ممکن نہیں۔''

یہ سفر چونکہ سمندر کے راستے ہونا تھا، اس لیے امین احسن نے واضح کیا کہ سمندری طوفان کی وجہ سے فی الحال سفر ممکن نہیں۔ لیکن اس ادبی جملے پر امام فراہی اَش اَش کر اٹھے اور فرمایا:

''امین میاں تو ادیب ہیں۔''

ادھر اس قدر طویل مدت تک درس قرآن کی تدریس ملتوی کرنا مناسب نہ تھا۔ ویسے بھی استاد کو اپنے ذہین و فطین اور لائق شاگرد پر مکمل اعتماد تھا کہ وہ اس کمی کو با آسانی پورا کر لیں گے۔ جو طالب علم اردو پڑھے بغیر اس کا اعلیٰ ادیب ثابت ہو گیا تھا اور جو تین برس دیر سے تعلیم شروع کر کے بھی سب سے آگے نکل گیا تھا، اس کے بارے میں ان کی توقع کیسے غلط ہو سکتی تھی!

واپسی پر امین احسن نے دیکھا کہ درس شروع ہو چکا ہے۔

پہلے والوں پر سبقت لے جانے والا

اعظم گڑھ کے ایک قریبی گاؤں ہی میں اگرچہ امین احسن کا سسرال تھا، لیکن راج پوتوں کی روایت کے مطابق ان کا وہاں قیام مناسب نہیں تھا۔ اسی لیے انھوں نے مدرسے ہی میں قیام کا فیصلہ کیا۔ ان کا کمرہ استاذ کے کمرے سے جنوب کی طرف تھا۔ اس کمرے کا انتخاب امام فراہی نے بطور خاص کیا تھا۔ قرائن سے واضح ہے کہ یہ حکم اس لیے تھا کہ امین احسن زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزاریں۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، مولانا اصلاحی کے بارے میں بعض وجوہات کی بنا پر خاص رویہ رکھتے تھے اور انھوں نے ''ذکر فراہی'' میں بعض مقامات پر اپنے غیر حقیقی تاثرات شامل کر کے خواہ مخواہ کی کج بحثیاں کی ہیں۔ اس کی تفصیل یقیناً کوئی خوش گوار عمل نہیں، مگر ضروری ہوا تو اس پر بھی قلم اٹھایا جا سکتا ہے۔ امین احسن نے اس درس میں دیر سے شامل ہونے کے باوجود جس دل جمعی کا مظاہرہ کیا، وہ ایک شائع ذائع امر ہے، لیکن وہ اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنی افتاد طبع کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں اور اسے روایت بالمعنٰی قرار دیتے ہوئے یہ لکھنے پر بھی مجبور ہیں کہ:

''باوجودیکہ وہ درس میں بعد میں شریک ہوئے مگر اپنی ذہانت، محنت، طبعی مناسبت اور دل چسپی

کی وجہ سے بہت جلد وہ سب کو پیچھے چھوڑ گئے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر مولانا فراہی اکثر حضرت مسیح کا یہ قول دہراتے تھے کہ کتنے ہی بعد میں آنے والے ایسے ہیں جو پہلے آنے والوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔" (ذکر فراہی 510)

شب و روز کے مشاغل

استاذ امین احسن مدرسہ میں عربی ادب اور تفسیر قرآن کے مضامین پڑھاتے تھے۔ وہ اس زمانے میں اپنے شب و روز کے معمولات کے بارے میں بتاتے ہیں کہ میرے معمولات بالکل متعین تھے اور میں ہر قیمت پر ان کی پیروی کرتا۔ صبح تین بجے بیدار ہوتا، نماز تہجد سے فارغ ہو کر پڑھنے میں مشغول ہو جاتا۔ مدرسہ میں روزانہ تین سے چار گھنٹے کی تدریس کی مصروفیت رہتی۔ ظہر کی نماز کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا فراہی کے کمرے میں جاتا اور قرآن کے مختلف مقامات کے بارے میں ان سے سوالات کرتا۔ مولانا شبلی نعمانی کے بھائی اسحاق نعمانی کے بیٹے فاروق نعمانی سے میری بڑی دوستی تھی۔ ان کے ساتھ شام کے وقت فٹ بال اور والی بال کھیلنے جاتا۔ جس دن کھیل کا موقع نہ ملتا، اس دن گھنٹا بھر عصر کے بعد سیر ضرور کرتا۔ رات کو پابندی سے نو بجے سو جاتا۔ اس کے علاوہ دن میں نہ سوتا۔

امین احسن بہت سنجیدہ قسم کے طالب علم تھے۔ دوست احباب کے ساتھ مل کر گپ شپ کرنے کی انھیں کوئی عادت نہ تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں ملنے ملانے میں بہت بخیل تھا۔ کسی نے ایک دن آکر امام فراہی سے شکایت کی تو انھوں نے فرمایا:

"یہ اپنے سے مشغول رہنے والے آدمی ہیں۔" (مولانا کی زبانی روایت)

استاد کی خدمت

امین احسن نے امام فراہی سے بھرپور علمی فیض حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت کو بھی اپنے لیے سعادت سمجھا۔ امام فراہی کے کمرے میں جب موقع ملتا خود جھاڑ پونچھ کا کام کرتے۔ مولانا بیان کرتے ہیں کہ مولوی اختر احسن کی بھی کوشش ہوتی کہ وہ بھی یہ خدمت کریں۔ اس لیے دونوں ہی اس سعادت کو حاصل کرنے کی سعی کرتے۔ ادھر امام فراہی اسے بالکل بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تبصرہ کرتے کہ بھئی آپ تو خود خدمت کیے جانے کے قابل

ہیں۔ اصل میں صفائی کے لیے باقاعدہ خدمت گار موجود تھا، لیکن یہ محض استاد سے تعلق خاطر اور محبت کا اظہار ہوتا۔

مولانا بتاتے ہیں کہ امام فراہی کی عادت تھی کہ وہ پنسل سے اپنے مسودات پر حواشی لکھتے۔ اس پنسل کو وہ خود تراشتے اور اس نفاست سے تراشتے کہ اس کا سکہ بہت باریک ہوتا۔ ہمیں بھی شوق ہوتا کہ ہم بھی اسی طرح تراشیں یا کم از کم استاد کے لیے یہ خدمت سرانجام دیں۔ بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ کوشش کی تو سکہ ٹوٹ گیا۔

یہ قصہ سناتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ امام فراہی کی نفاست اور خوش ذوقی ان کی عمومی عادات سے بھی جھلکتی تھی۔ بتاتے کہ کسی شخص کے باسلیقہ ہونے کا سب سے بڑا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ آم کھا رہا ہو۔ اور امام فراہی جب آم کھاتے تو صرف تین انگلیوں سے سلیقے سے کھاتے کہ حیرت ہوتی کہ آم جیسا پھل بھی اس قدر نفاست سے کھایا جاسکتا ہے!

علمی امین

اس بات کا امین احسن کو بھی احساس تھا کہ ان کے استاد ان پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ میں ان کے مسودات کو یک جا کر کے متعلقہ عنوان کے تحت مرتب کرتا تھا۔ اور ایسا خاص انھی کے حکم سے تھا۔ اسی لیے جب میرے ہاتھ میں رعشہ کی وجہ سے خفیف سی لرزش آئی تو اس سے خط متاثر ہوا۔ میں نے اپنی ہی نگرانی میں یہ کام کسی اور سے لینا شروع کیا۔ اب جب استاد امام نے نظر ثانی کے لیے یہ مرتب شدہ مسودہ دیکھا تو کسی اور کا خط دیکھ کر پہچان گئے۔ فرمایا: مجھے تمھارا خط بہت پسند تھا، کسی اور سے یہ کام کیوں کرایا؟ تب انھوں نے اس کی وجہ بتائی تو وہ مطمئن ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال محض رسم الخط کی خوب صورتی کی وجہ سے نہ تھا۔ معاملہ یقیناً اس امانت و دیانت اور اہلیت و ذکاوت کا تھا جس میں امین احسن کا ان کے نزدیک کوئی مقابلہ نہ تھا۔ یاد رہے کہ بعد میں مولانا کا ہاتھ رعشہ کی وجہ سے بہت زیادہ کانپنے لگا اور وہ لکھنے سے بالکل معذور ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں بعض دل چسپ واقعات کا ذکر بعد میں ہو گا۔ (ان شاء اللہ)

تلمذ کی وسعت

سوال یہ ہے کہ امین احسن نے اپنے استاد سے کس حد تک اکتساب کیا؟ خود مولانا اس حوالے

سے تحریر فرماتے ہیں:

”میں پورے چھ سال ان کی صحبت میں شب و روز رہا۔ اس چھ سال کی صحبت میں شاید ہی کوئی صبح و شام ایسی گزری ہو جس میں مجھے علمی، مذہبی، ادبی اور سیاسی مسائل پر ان سے کھل کر بحث کرنے اور ان کے خیالات معلوم کرنے اور اپنے شبہات ان کے سامنے پیش کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔“ (مجموعہ تفسیر فراہی 31)

مولانا سے زبانی روایت ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے اس طرح بیان کی ہے:

”یہ اللہ کا ایک انعام تھا کہ انھوں نے خود مجھے دعوت دی کہ میں ان سے قرآن پڑھوں۔ پانچ سال پورے ان کے ساتھ گزارے۔ اس کے بعد ان کی وفات ہوئی تو مجھ پر قرآن کے فہم کی راہ کھل چکی تھی۔ اس کے بعد سے قرآن ہی میری دل چسپی کا مرکز و محور رہا۔ ساتھ ہی ادب عربی اور فلسفے کے وہ مباحث بھی پڑھے جن کا تعلق قران مجید سے ہے۔ الحمدللہ سے لے کر والناس تک پورا قرآن پڑھا۔ میری ہی وجہ سے مدرسے میں انھوں نے درس شروع کیا۔“

(ذکر فراہی 570)

ان دو بیانات میں استفادے کی مدت میں ایک برس کا فرق ہے۔ لگتا ہے کہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی یہ خیال کرتے ہیں کہ مولانا نے چھ ماہ ملایا (ملائیشیا) میں بسر کیے تھے، اس لیے یہ پورے چھ برس نہیں بنتے۔ چنانچہ انھوں نے اس مدت میں خود ہی ایک برس کی کمی کر دی۔ جب کہ 1925ء اور 1930ء کے دونوں برسوں کو شمار کریں تو اتنے ہی برس بنتے ہیں۔ مولانا نے اسی لیے اسے چھ برس لکھا۔ ویسے بھی اعلیٰ نسبت میں کمی کرنا بے ادبی اور بد ذوقی ہے، اس لیے مولانا نے پونے چھ یا ساڑھے پانچ کے بجائے پورے چھ برس بیان کیا۔

مولانا کا یہ بیان کہ انھوں نے ہر موضوع پر اپنے استاد سے تبادلۂ خیال کیا، بہت واضح ہے۔ لیکن اسے ایک واقعے کی مثال سے سمجھا جائے تو صورت حال مجسم ہو جاتی ہے:

مولانا بتاتے ہیں: عربی کا ایک قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ ’لا‘ سمجھ میں نہیں آیا۔ سب شارحین کو دیکھا، ادیب الہند مولوی فیض الحسن سہارن پوری کی شرح بھی دیکھی، لیکن کسی رائے پر اطمینان نہیں ہوا۔ کتاب لے کر امام فراہی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اپنے دارالمطالعہ کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے مشکل بیان کی، لمحے بھر کو رکے، جیب سے پنسل نکالی اور میری کتاب

پر لکھا:

”’لاَ هِيَ نَادِرَة‘۔ میاں، جس طرح تم لوگ نہیں کہتے کہ جس گھڑی میری موت ”نہ“ آ جائے، یہ اِسی طرح کا ’لاَ‘ ہے۔“

یہ روایت ہم نے استاذ محترم جاوید احمد صاحب غامدی کے الفاظ میں نقل کی ہے۔ ان کے بیان کا مطلب ہے کہ عربی کی کلاسیکی شاعری کے مجموعے کو پڑھتے ہوئے مولانا کو ایک شعر میں لفظ ’لا‘ کا درست مفہوم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہاں ’لا‘ کا وہی مفہوم سمجھ رہے تھے جو کہ اس کا عمومی طور پر ہوتا ہے یعنی ”نہیں“۔ لیکن امام فراہی نے انھیں سمجھایا کہ یہاں اس کا معنی ”نفی“ میں نہیں، بلکہ یہ محض تفخیم شان کے لیے ہے۔

اردو میں ہم اس کی مثال غالب کے اس شعر سے سمجھ سکتے ہیں:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طُور کی

اس شعر میں ”نہ“ وہی ہے جس کی طرف امام فراہی نے اشارہ کیا۔

اس سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ:

امین احسن کو استاد سے سوال پوچھنے میں کوئی حجاب نہ تھا، علمی قسم کا اور نہ مقام و مرتبے کے دبدبے کا۔

بے تکلفی اور تعلق خاطر ملاحظہ کیجیے کہ خود شاگرد کی کتاب پر اس کی مشکل کا حل ثبت کر دیا۔

مثال ملاحظہ فرمائیں، اُسی ادبی اسلوب میں اور طالب علم کو اسی کی زبان میں دی کہ فہم گویا ”قطعی الدلالہ“ ہو گیا۔

اور یہ روایت بیان کرتے ہوئے مولانا نے یہ تبصرہ کیا:

”زبان کے غوامض تک پہنچنے کا یہ انداز صرف استاد ہی کا حصہ تھا۔“

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے یہ واقعہ کئی مرتبہ سنایا اور بہت سے احباب کو سنایا۔ وہ جب یہ بیان کرتے تھے تو لگتا تھا کہ وہ استاذ کے پہلو میں کھڑے ہیں اور ان لمحات کو چشم تصور سے دیکھ رہے ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امین احسن کی علمی، ادبی اور اخلاقی تربیت کا

معیار کتنا بلند ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"اواخر عمر میں مرحوم (امام فراہی) کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ وہ چند مستعد طلبہ کو اپنے مذاق کے مطابق تیار کریں۔ چنانچہ کم از کم دو طالب علموں کی خاص طور پر انھوں نے ذہنی تربیت کی۔" (معارف: شمارہ جنوری 1998، مولانا ضیاء الدین اصلاحی)

ان دو شاگردوں سے مراد مولانا امین احسن اور مولانا اختر احسن ہیں۔ دوسری جگہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے "معارف" کے اسی مضمون میں آگے جا کر واضح کر دیا ہے کہ:

" مولانا امین احسن اصلاحی کے فخر و امتیاز کے لیے یہی کافی ہے کہ انھیں مولانا فراہی کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا۔ اور وہی ان کے سب سے ممتاز شاگرد کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ جس کا حق بھی انھوں نے خاطر خواہ طور پر ادا کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ بعض مستعد طلبہ نے مولانا فراہی کے اس درس کا پورا فائدہ اٹھایا جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن صاحب اصلاحی ہیں۔ ہماری آیندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہیں۔"

سیاسیات اور فلسفے کی تعلیم

علوم دین اور عربی زبان ہی نہیں، امین احسن نے انگریزی زبان کی کچھ کتب اور سیاسیات کے مضامین بھی امام فراہی سے پڑھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میں نے جرمن مصنف بلینچلی کی کتاب "تھیوری آف اسٹیٹ" سبقاً سبقاً پڑھی۔

یہ کتاب جرمن اسکالر Johann Kaspar Bluntschli (جون کیسپر بلینچلی) کی تصنیف ہے جو پہلی دفعہ 1875ء میں جرمن زبان میں اور پھر 1895ء میں انگریزی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی۔ اس میں ریاست کے تصور اور اس کے عہد بعہد ارتقا پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کو لفظ بلفظ پڑھنے کا مطلب یہی ہے کہ اس میں موجود مضامین کے فہم کے ساتھ ساتھ اس کی زبان کو بھی زیر بحث لایا گیا ہو گا۔ مولانا اصلاحی بتاتے ہیں کہ اس کتاب کی تدریس سے انھیں اپنی کتاب "اسلامی ریاست" لکھنے میں بڑی مدد ملی۔

فلسفے کے حوالے سے مولانا اصلاحی نے بتایا کہ انھوں نے متعدد کتب کے مباحث امام فراہی

کی مدد سے پڑھے۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی گواہی ہے کہ:

”اسی زمانے میں اصلاحی صاحب نے قرآن مجید کے علاوہ عربی ادب اور فلسفے کی بعض وہ شاخیں بھی پڑھیں جن کا تعلق قرآن اور قرآن فہمی سے تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ استفادہ حلقۂ درس قرآن سے باہر الگ کیا ہو گا۔“ (صفحہ 510)

حدیث کا درس

معلوم ہوتا ہے کہ امین احسن نے قرآن مجید، فلسفہ اور علم سیاسیات کے علاوہ حدیث کی تفہیم میں بھی امام فراہی سے استفادہ کیا تھا۔ اس حوالے سے اپنا ایک قصہ انھوں نے کئی مرتبہ سنایا۔ بتاتے تھے کہ جامع ترمذی کی عبارت پڑھتے ہوئے میں نے ایک جگہ پورے اعتماد سے 'عَرَفَ' کو 'ر' کی زیر کے ساتھ پڑھا۔ استاد امام نے ٹوکا:

'أنا لا أعْرِفُ عرِف' (یعنی میں اِسے 'ر' کی زیر کے ساتھ نہیں جانتا)۔

امین احسن نے اصرار کیا اور اِسی اعتماد کے ساتھ جواب دیا: 'أما أنا فَلَا أعْرِفُ عرَف' (اور میں اِسے 'ر' کی زبر کے ساتھ نہیں جانتا)۔

امام فراہی نے فرمایا: 'رَاجِع اللُغَة' (لغت دیکھیے)۔

لغت کی کتاب، جوہری کی ”صحاح“ کھولی تو استاد ہی کی بات لکھی ہوئی تھی۔ میں کچھ ہلکا پڑا تو مسکرائے، اور فرمایا: 'استَأنِف، ولِلْجَوادِ زِلَّة' (آگے چلو، اصیل گھوڑا بھی پھسل جاتا ہے)۔

یقیناً استفادے کی یہ نوعیت وہ نہیں رہی تھی جو قرآن کے ساتھ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ بطور ریڈر ترمذی پڑھ رہے ہوں یا اس سے کوئی اقتباس دیکھنا ہو۔

مسئلۂ جبر و قدر کی الجھن

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا سامنا ہر اس طالب علم کو پیش آ سکتا ہے جو اپنے سوال کو دبانے کے بجاے اس کا تسلی بخش جواب چاہتا ہے۔ مولانا بتاتے ہیں کہ ان کے ذہن میں بھی یہ الجھن پیدا ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ کو ہر انسان کے عمل کے مستقبل کا علم ہے تو اسے جواب دہ کیوں ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہے کہ وہ بدی اور جرم کرے گا۔ اب اللہ تعالیٰ

کا علم تو ناقص نہیں ہو سکتا۔ وہ شخص لازمی طور پر یہ کام کرے گا۔ یوں وہ شخص اس فعل کا ذمہ دار کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

یہ سوال انھیں مدرسے کے زمانۂ طالب علمی میں پیش آیا یا امام فراہی کے زمانۂ تلمذ میں، یہ نہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی روایت سے واضح ہوتا ہے اور نہ ہم سے بیان کی گئی روایت سے۔ البتہ ڈاکٹر شرف الدین کے مطابق جب مولانا یہ بیان کرتے ہیں کہ میں استاذ امام کے کمرے میں جا کر ان کی چارپائی کی پائینتی میں بیٹھ گیا تو وہ سمجھ گئے کہ کوئی الجھن درپیش ہے، تو گمان غالب ہے کہ یہ ان کے دوسرے دور کا سوال ہے۔

مولانا بیان کرتے ہیں کہ استاذ نے صرف یہی بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہوتا ہے کہ بندہ اس کام کو اپنے اختیار سے کرے گا، اسی لیے وہ جواب دہ ہو گا۔ مولانا بتاتے ہیں کہ یوں محض چند لفظوں یعنی ''اپنے اختیار سے'' کہنے سے ان کا ذہن اس حوالے سے ہمیشہ کے لیے واضح ہو گیا۔

مولانا نے اس موقع پر اپنے استاذ کی یہ خوبی بھی بتائی کہ وہ اتنے حکیم تھے کہ مخاطب کی سطح پر آ کر ٹھیک اس الجھن کو دور کرتے جو مخاطب کے ذہن میں ہوتی۔

الحاد کا مسئلہ

شاید یہی موقع تھا یا کوئی اور کہ ہم نے الحاد کے بارے میں ان سے پوچھا کہ کیا اس حوالے سے ان کے ذہن میں اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں کوئی الجھن کبھی پیش ہوئی؟ فرمانے لگے کہ اس میں بھی میرا حال اپنے استاذ امام جیسا ہے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ بس زندگی میں ایک دفعہ اس پر سرسری سا شبہ ہوا۔ جس لمحے میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا تو میں نے غور کیا: کیا یہ کائنات بے خدا ہو سکتی ہے؟ جواب ملا کہ اگر یہ دنیا پابند نہ ہوتی تو اس پر سوچا جا سکتا تھا۔ بس اس دلیل نے میرے لیے الحاد کو ناقابل غور امر بنا دیا۔ اور مجھے بھی زندگی میں بس ایک لمحہ کے لیے اس سوال کا سامنا ہوا۔ اور عقل نے یہی جواب دیا کہ الحاد غیر عقلی چیز ہے۔ ایسے ہی کئی مواقع پر مولانا اپنا وہ شاہکار جملہ بولتے کہ یہ علت و معلول وجود باری تعالیٰ کے حوالے سے کوئی دلیل نہیں۔ یہ معلول تو کوئی 'بھتنا' بھی ہو سکتا ہے۔ مگر میں تو ایک حیُّ القیوم اور قادرِ مطلق کو مانتا ہوں جس کی صفات کا تعارف خود اس نے ہمیں اپنی کتاب میں کرایا۔ اور جو ہمیں کائنات میں صاف نظر آتا ہے۔

استاد سے تعلق خاطر

اس باب میں ہم استاذ محترم جاوید احمد صاحب غامدی کا ایک اقتباس نقل کرنا ہی کافی سمجھتے ہیں:

> ”بتاتے تھے:... فراہی کے آخری زمانے میں ہندوستان کے ایک بڑے عالم نے اُن کی کسی تحریر پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ اِس سے پورے علاقے میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مدرسۃ الاصلاح کے طلبہ اور اساتذہ، سب پریشان تھے۔ میرے لیے بھی یہ ایک بڑا سانحہ تھا۔ اِسی اضطراب اور پریشانی کے عالم میں فراہی کو ڈھونڈتا ہوا اُن کے دارالمطالعہ کی طرف بھاگا۔ میں نے دیکھا، استاذ امام سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ دوڑ کر وہیں اُنھیں بتایا۔ میں خود جس پریشانی میں تھا، اُن سے بھی اِسی کے لحاظ سے کسی ردعمل کی توقع کر رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے زینے پر رکے، پھر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے: اچھا، یہ جن کا تم ذکر کر رہے ہو، وہ تو مجھے نہیں جانتے۔ میں ہکا بکا اُنھیں دیکھتا کھڑا رہ گیا۔ اِس فتوے پر اِس سے زیادہ بلیغ کوئی تبصرہ شاید کبھی نہ ہو سکے۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں کہتے: فراہی یہ تھے، اِس شان کا کوئی شخص اب تم کہاں سے پیدا کرو گے؟“
>
> (مقامات 84-83)

واضح رہے کہ مولانا فراہی پر کفر کے معروف فتوے دو دفعہ لگائے گئے۔ ایک خود ان کی زندگی میں اور دوسرا ان کی وفات کے بعد۔ اس فتوے کا تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا۔

[باقی]

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

پتھر

فلک مقام پہاڑوں میں ہر طرف پتھر
سپید و سرخ مثالِ وجود گونا گوں
یہ سب جمود و صلابت میں مثلِ چرخ بری
نہ اُن میں گرم نگاہی، نہ اُن میں سوزِ دروں

اِسی زمین پہ کھوئے ہوئے زمانوں میں
کیا ہے چشمِ فلک نے عجیب نظارہ
شہیدِ جلوۂ یزداں ہوا کوئی پتھر
کسی کے جسم سے پھوٹا ہوا ہے فوارہ

میں اپنی قوم سے پوچھوں کہ تیرے پہلو میں
یہ ایک دل ہے کہ نرم و گداز مثلِ حریر

میں پوچھتا ہوں کہ میری ہزار سالہ نوا
یہ کیا کہ اِس پہ ہمیشہ رہی ہے بے تاثیر

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے حجاب کرے

شاہد محمود

خبر نامہ ''المورد امریکہ''

[فروری 2024]

''قرآن وسنت کا باہمی تعلق'' کی آڈیو بک

یہ ڈاکٹر عمار خان ناصر کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اصول فقہ کی اس اہم ترین بحث کا ایک تاریخی مطالعہ پیش کرتی ہے کہ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ اس کتاب میں فقہاے صحابہ کے رجحانات سے لے کر مکتب فراہی تک سامنے آنے والے بنیادی اصولی مواقف کا مبسوط جائزہ لیتے ہوئے تطبیقی مثالیں بھی تفصیلاً پیش کی گئی ہیں۔ انھوں نے امریکہ میں اپنے قیام کے دوران میں غامدی سینٹر کے اسٹوڈیو میں اس کتاب کی آڈیو ریکارڈنگ کرائی تھی۔ اس کتاب کی آڈیو ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر سلسلہ وار نشر کی جا رہی ہے۔ ماہ جنوری میں اس کی 2 اقساط نشر کی گئیں۔

''اسرا و معراج''، ''شق القمر'' اور ''نزولِ مسیح'' کی اشاعت

جناب جاوید احمد غامدی کے موقف کی وضاحت میں یہ کتابیں شائع ہو کر دنیا بھر میں ''المورد'' کے مراکز پر دستیاب ہیں۔ انھیں سید منظور الحسن نے تالیف کیا ہے۔ پاکستان میں یہ ''المورد'' کے علاوہ الحمد پبلی کیشنز، پرانی انار کلی لاہور اور ''انذار'' کراچی سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یہ آن لائن

بھی دستیاب ہیں۔

''عدت میں نکاح: جناب جاوید احمد غامدی کا موقف''

محمد حسن الیاس صاحب نے اس مضمون میں عدت میں نکاح کے بارے میں جاوید احمد غامدی صاحب کے موقف کو واضح کیا ہے۔ عدت میں نکاح کرنے کے حوالے سے علماے احناف کے موقف کو پیش کرنے کے بعد اُنھوں نے لکھا ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک عدت کے دوران میں نکاح کرنا صریح گناہ ہے اور اس کا مرتکب قیامت میں جواب دہ ہو گا۔ البتہ قانونی طور پر اس نکاح کو منعقد سمجھنا چاہیے اور اس مسئلے کو عدالت میں لے جانے کے بجاے خاندانی سطح پر حل کرنا چاہیے۔ انھوں نے غامدی صاحب کے اس موقف پر مذہبی حلقوں کی طرف سے اٹھائے جانے والے اعتراضات کو بھی موضوع بحث بنایا ہے اور اُن پر اپنی تنقید پیش کی ہے۔ یہ مضمون اشراق، امریکہ کے جنوری 2024 کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

غامدی سینٹر کا ممبر شپ پروگرام

غامدی سینٹر نے ایک ممبر شپ پروگرام کا آغاز کیا ہے جس کے ذریعے سے کوئی بھی شخص ادارے اور اس کی ٹیم کا حصہ بن سکتا ہے۔ ادارے کی جانب سے تین طرح کی ممبر شپ متعارف کرائی گئی ہے۔ ایک Contributor Friends، دوسرے Advocate Friends اور تیسرے Ambassador Friends۔ ان کی ماہانہ فیس بالترتیب 10 ڈالر، 50 ڈالر اور 100 ڈالر ہے۔ اس ممبر شپ کے نتیجے میں ممبران کو غامدی سینٹر کی کتابوں پر خصوصی رعایت کے ساتھ ساتھ متعدد کئی سہولیات فراہم کی جائیں گی۔ دل چسپی رکھنے والے حضرات درج ذیل لنک پر جا کر ممبر شپ حاصل کر سکتے ہیں:

ghamidi.org/member

''تنقیدات''

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ''تنقیدات'' کے عنوان سے جاوید احمد غامدی صاحب پر مختلف حلقوں کی جانب سے ہونے والی تنقیدات کو جمع کر کے ادارے کی ویب سائٹ پر شائع کرنے کا

سلسلہ جاری ہے۔ اب تک تقریباً چالیس متفرق تحریریں شائع ہو چکی ہیں جن میں تصوف، کلام، سیاست و اقتصادیات، فلسفہ و سائنس، علمیات و اصول، فقہ و قانون، تفسیر و حدیث اور زبان و ادب کے دائروں کی تحریریں شامل ہیں۔

”دین کا عالم کیسے بنا جائے“

گذشتہ ماہ آسٹریلیا سے ایک نوجوان حمزہ خالد اپنے والد خالد رفیق صاحب کے ساتھ غامدی سینٹر، امریکہ آئے۔ ان کے والد اپنے بیٹے میں عالم بننے کا جذبہ دیکھتے ہوئے انھیں غامدی سینٹر، امریکہ لے آئے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو پہچان سکیں اور یہ جان سکیں کہ دین کا عالم کیسے بنا جاتا ہے۔ غامدی سینٹر میں اپنے ہفت روزہ قیام کے دوران میں حمزہ خالد نے حسن الیاس صاحب کے ساتھ متعدد نشستیں کیں۔ ان نشستوں میں انھوں نے حسن الیاس صاحب کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو جاننے کے ساتھ ساتھ اس حوالے سے بھی بات کی کہ دین کا عالم کیسے بنا جائے اور اس کے لیے کون سی صلاحیتیں ہونی چاہییں۔

”کیا دین کی شرح و وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری تھی؟“

یہ سوال 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز کے موضوع ”حدیث کیا ہے؟“ کی جنوری 2024 کی نشستوں میں زیر بحث رہا۔ غامدی صاحب نے بتایا کہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ، آپ کی سیرت و سوانح اور آپ کی تفہیم و تبیین شامل ہے۔ ان نشستوں میں غامدی صاحب نے مذکورہ سوال کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نقطۂ نظر پر اپنی رائے بیان کرتے ہوئے لفظ ”تبیین“ کی مفصل وضاحت کی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

”حصول جنت کے لیے اللہ کا مقررہ طریقہ: تزکیۂ نفس“

مدیر ”اشراق، امریکہ“ سید منظور الحسن کا یہ مضمون جنوری 2024 کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ جنت کے حصول کے لیے اللہ کا مقرر کردہ طریقہ تزکیۂ نفس ہے۔ اُنھوں نے واضح کیا ہے کہ انسان کا نصب العین جنت ہے اور اِسی جنت کو

پانے کے لیے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اللہ کا دین، اس کی کتابیں اور اُس کے پیغمبر اِسی کو پانے کے لیے انسان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے ہیں۔ چنانچہ جو شخص اپنے ظاہر و باطن اور اپنے عقیدہ و عمل کو پاکیزہ بنائے گا، جنت کے دروازے اُسی کے لیے کھولے جائیں گے۔

''تبدیلی کا مذہبی بیانیہ''

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ہونے والی ہفتہ وار سوال و جواب کی نشست میں ''تبدیلی کا مذہبی بیانیہ'' کے عنوان سے ایک نئے موضوع کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر گذشتہ ماہ ہونے والی تین نشستوں میں اس بات پر گفتگو ہوئی کہ مذہبی طبقے کی اصل مشکل کیا ہے اور اس مشکل کو کیسے حل کیا جائے؟ مزید برآں مسلم تہذیبی روایت میں لمبے عرصے سے جاری مذہبی طبقے اور ریاست کے مابین کشمکش کے حوالے سے بھی گفتگو ہوئی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

''البیان'' اور ''میزان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

ڈاکٹر شہزاد سلیم ہر مہینے غامدی صاحب کی تفسیرِ قرآن ''البیان'' اور اسلام پر ان کی کتاب ''میزان'' پر انگریزی زبان میں لیکچرز دیتے ہیں۔ گذشتہ ماہ ''البیان'' کی 4 نشستوں کا انعقاد ہوا، جن میں سورۂ بقرہ کی آیات 186 تا 245 زیر بحث آئیں۔ ''میزان'' سیریز کے تحت ''The Social Shariah'' کے عنوان سے ڈاکٹر شہزاد سلیم نے دو لیکچرز ریکارڈ کیے۔ ان لیکچرز میں طلاق کے مسئلے پر گفتگو ہوئی۔ یہ لیکچرز غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

قرآن و حدیث کا ہفتہ وار درس

جنوری 2024 میں غامدی صاحب کے قرآن و حدیث کے لائیو درس کی 15 نشستیں منعقد ہوئیں، جن میں سورۂ بنی اسرائیل کی 4 تا 26 آیات کا درس دیا گیا، جب کہ درس حدیث کی نشستوں میں ''انسان کی تخلیق کا عمل اور علم الٰہی'' اور ''فرشتے، تصاویر اور کتا'' کے موضوعات کی احادیث زیر بحث آئیں۔ قرآن و حدیث کے دروس کی یہ نشستیں غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

”علما اور عوام میں دوری کیوں؟“

گذشتہ ماہ جناب حسن الیاس نے المورد، ہند کے ساتھ ایک آن لائن سیشن میں شرکت کی۔ اس سیشن میں حسن الیاس صاحب نے علما اور عوام میں دوری کی تین وجوہات بیان کیں: ایک یہ کہ ہمارے علما عام آدمی کی ذہنی سطح کا لحاظ رکھے بغیر خالص علمی اور مذہبی اصطلاحات میں عام آدمی کے سامنے اپنی بات رکھتے ہیں۔ دوسرے، علما اپنے نقطۂ نظر کی بنیاد اور استدلال پر دوسرے کو قائل کرنے کے بجاے اپنا نقطۂ نظر زبردستی دوسرے پر تھوپنا چاہتے ہیں اور تیسرے یہ کہ علما عام آدمی کو مسئلے کا وہ حل بتاتے ہیں جس پر عمل کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ اس سیشن کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم کے آن لائن نجی مشاورتی سیشن

گذشتہ ماہ ڈاکٹر شہزاد سلیم نے متعدد لوگوں کے ساتھ آن لائن نجی مشاورتی سیشن کا اہتمام کیا، جن میں لوگوں نے آپ سے والدین کو درپیش مشکلات اور نوعمری اور ازدواجی مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

مولانا اصلاحی کی ازدواجی اور عملی زندگی

اشراق، امریکہ کے گذشتہ ماہ کے شمارے میں نعیم بلوچ صاحب نے ”حیات امین“ کی چھٹی قسط میں مدرسۃ الاصلاح کی ادبی فضا کے ساتھ ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی کے پسندیدہ استاد، سب سے اچھے دوست اور ہم جماعت کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کی ازدواجی اور عملی زندگی کے حوالے سے لکھا کہ مولانا مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم کی تکمیل کے آخری سال میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ان کی پہلی شادی اپنے ہی خاندان میں ہوئی اور ان کی پہلی بیوی سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، جب کہ اپنی پہلی بیوی کی وفات کے بعد انھوں نے دوسری شادی 1945ء میں کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے ایک سہ روزہ اخبار ”مدینہ“ میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے بعد ”الناظر“ اور پھر ہفت روزہ اخبار ”سچ“ میں ملازمت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

”البیان“ ترجمۂ قرآن کی آڈیو بک

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام تذکیر بالقرآن پراجیکٹ کے تحت قرآن مجید کو ایک سال میں سنانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ غامدی صاحب کے ترجمۂ قرآن کو شاہ نواز صاحب نے اپنی دل کش آواز میں ریکارڈ کرایا ہے، جب کہ قرآن مجید کی تلاوت مشاری راشد العفاسی کی آواز میں ہے۔ ہر ہفتے اس کی ایک قسط غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر نشر کی جاتی ہے۔ اب تک اس کی 14 اقساط نشر ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم کے متعدد موضوعات پر لیکچرز

ڈاکٹر شہزاد سلیم ہر مہینے Lessons of Life Series کے زیر عنوان معاشرتی، اخلاقی اور دینی موضوعات سے متعلق مختصر دورانیے کے متعدد لیکچرز ریکارڈ کراتے ہیں۔ جنوری 2024 میں انھوں نے جن موضوعات پر گفتگو کی وہ یہ ہیں: ”اپنی نگاہوں کی حفاظت کرو“، ”اپنے ایمان میں اضافہ کریں“، ”کامیاب شادی کے چار مراحل“، ”شادی میں جھگڑوں سے کیسے بچا جائے“، ”عملی آدمی نہ کہ تارک دنیا“، ”مسلسل خبردار“، ”اصلی مقابلہ“، ”جب موت مرے گی“، ”سچ کی تلاش“۔ اس کے علاوہ انھوں نے ”مسئلۂ فلسطین کا مذہبی پس منظر“، ”انسانیت“، ”نماز کا فلسفہ و حکمت“ اور ”خوش گوار ازدواجی زندگی کے لوازم“ پر بھی لیکچرز دیے۔ یہ لیکچرز غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

جنوری 2024 میں جناب حسن الیاس نے نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں پر غامدی صاحب کی رہنمائی میں 4 فتوے جاری کیے۔

”مطالعۂ سیرت“ کی آڈیو بک

”مطالعۂ سیرت“ مولانا وحید الدین خان کی کتاب ہے۔ غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ڈاکٹر خالد ظہیر نے اس کتاب کو اپنی آواز میں ریکارڈ کرایا ہے۔ اس کتاب کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل

پر ہر ماہ سلسلہ وار نشر کیا جا رہا ہے۔ جنوری 2024 میں اس کی دو اقساط نشر کی گئیں جو ادارے کے یوٹیوب چینل پر موجود ہیں۔

''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ''

دنیا نیوز پر نشر ہونے والے غامدی صاحب کے ہفتہ وار پروگرام ''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ'' میں ماہ جنوری میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا، وہ یہ ہیں: ''انفاق فی سبیل اللہ کے حدود و شرائط''، ''اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر''، نفسی و مادی علوم اور وحی کا علم'' اور ''سوال و جواب''۔ ان پروگراموں میں لوگوں کی طرف سے پوچھے جانے والے متفرق سوالوں کے جوابات کے ساتھ ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں اسلامی تعلیمات، اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر، اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کی اقدار میں فرق، Humanism کا فلسفہ اور نفسی علوم کے قوانین اور وحی کے علم پر بات کی گئی۔ ان پروگراموں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔